تعلیم و تربیت
اگست
2012
عید الفطر
آزادی مبارک
چچا تیز گام نے بچوں کو
عیدی دی
صفحہ نمبر:25

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
بچوں کا محبوب رسالہ

اگست 2012ء

72واں سال چوتھا شمارہ | رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

پیارے بچو! ہماری طرف سے یوم آزادی پر دلی مبارک باد قبول کریں۔

یہ واقعہ ان دنوں کا ہے جب قیام پاکستان کو تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ ایک بڑھیا اپنی گٹھڑی لیے بڑی مشکل سے ریل کے ڈبے میں داخل ہوئی۔ کچھ دیر بعد ایک ٹکٹ چیکر ڈبے میں آ کر مسافروں کے ٹکٹ چیکر کرنے لگا۔ جب بڑھیا کی باری آئی تو اُس نے التجا کرتے ہوئے کہا: ''بیٹا! میں اپنا سب کچھ کھو کر آئی ہوں، میری کل کائنات یہی گٹھڑی ہے، مجھ پر رحم کرو۔'' یہ سن کر ٹکٹ چیکر کچھ دیر خاموش رہا پھر رندھی ہوئی آواز میں بولا: ''اماں! آپ نے جو کچھ بتایا ہے وہ درست ہے، مگر آپ ہی بتایئے ٹکٹ کے بغیر ریل میں سفر کرنے سے پاکستان کیسے چلے گا، جس کے لیے آپ نے اور ہم سب نے بے شمار قربانیاں دی ہیں، ٹکٹ تو آپ کو لینا ہوگا تاکہ ملک کو نقصان نہ ہوا البتہ ٹکٹ کے پیسے میں اپنی جیب سے ادا کروں گا۔''

یہ واقعہ ہم سب کے لیے قابلِ تقلید مثال ہے کہ ہم کوئی ایسا کام نہ کریں، جس سے پیارے پاکستان کو نقصان پہنچے۔ رمضان المبارک کے بابرکت مہینے کی ۲۷ ویں شب کو پاکستان کا قیام اِس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ ارضِ پاک عطیۂ خداوندی ہے۔ پاکستان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ دُنیا کا پہلا اسلامی ملک ہے جو ایٹمی قوت کا حامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِس کو بے شمار معدنی خزانوں سے نوازا ہے، مگر اس کے باوجود ہم ابھی تک اپنی منزل سے بہت دُور ہیں۔ ایسا اِس لیے ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اس تحفے کی قدر نہیں کی۔ ہم اِس وقت بہت سے خارجی اور داخلی مسائل سے دو چار ہیں۔ اِن مسائل سے ہم اسی طرح نبرد آزما ہو سکتے ہیں کہ ہم اپنے مفادات کی بجائے یک جان اور یک قالب ہو کر صرف اور صرف پاکستان کے مفاد کے لیے سوچیں۔ آج ہم جو کچھ بھی ہیں وہ پاکستان کی وجہ سے ہیں، اِس کے وجود سے ہماری شناخت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا کیجیے کہ ہم جن مسائل سے دو چار ہیں وہ مسائل جلد از جلد ختم ہو جائیں اور پاکستان امن وسکون کا گہوارہ اور ایک ترقی یافتہ ملک بن جائے۔

ہمیں اُمید ہے کہ آپ رمضان المبارک کی بابرکت ساعتوں سے بھرپور فیض یاب ہو رہے ہوں گے۔ اِسی ماہ کے تیسرے ہفتے میں عیدالفطر منائی جائے گی۔ ہماری طرف سے خوشیوں بھری میٹھی میٹھی عید کی پیشگی مبارک باد قبول کریں۔ اب آپ اِس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء و تجاویز سے آگاہ کیجیے۔

خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: عیدالفطر، جشنِ آزادی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر ماہنامہ ''تعلیم و تربیت'' 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 6278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-6278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)= 500 روپے۔
مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے)= 1500 روپے۔
ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے)= 1500 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے)= 1500 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 25 روپے

عید کا لفظی معنی ہے ''بار بار آنا'' چوں کہ یہ دن ہر سال بار بار آتا ہے اس لیے اسے ''عید'' کہتے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب پیارے نبی ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو انہوں نے دیکھا کہ اہل مدینہ دو تہوار مناتے ہیں اور ان میں کھیل تماشے کرتے ہیں، آپ ﷺ نے اُن سے پوچھا۔تم یہ جو دو دن خوشیوں کے مناتے ہو اس کی کیا حقیقت ہے؟ انہوں نے عرض کیا ہم زمانہ جاہلیت میں اسلام سے پہلے یہ تہوار اسی طرح مناتے تھے بس وہی رواج چلا آ رہا ہے کہ اب بھی یہ دن اسی طرح خوشی کے طور پر مناتے ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ان دو تہواروں کے بدلے میں ان سے بہتر دو دن تمہارے لیے مقرر کر دیئے ہیں۔عید الفطر یعنی چھوٹی عید کا دن۔عید الاضحیٰ یعنی بڑی عید کا دن۔ (ابو داؤد)

پیارے بچو! جب عید کا چاند نظر آتا ہے تو روزے مکمل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد آنے والا دن یکم شوال ''عید الفطر'' یعنی چھوٹی عید کا دن کہلاتا ہے، اسلام میں یہ عید کا دن ہے۔ جس دن نیا یا صاف ستھرا لباس پہن کر، کوئی میٹھی چیز کھا کر، راستے میں آہستہ آہستہ آواز میں تکبیر کہتے ہوئے عیدگاہ جایا جاتا ہے، جہاں دو رکعت نماز بطور شکرانہ ادا کی جاتی ہے، عیدگاہ جانے سے پہلے ''صدقۂ فطر'' ادا کیا جاتا ہے تا کہ عید کی خوشیوں میں غرباء و مساکین بھی شریک ہو جائیں یہ دن ایسا ہے، جس میں گلی کوچوں میں اللہ کے فرشتے پھیل جاتے ہیں، عید گاہ جانے والوں کا استقبال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرشتوں کو گواہ بنا کر روزہ داروں اور تراویح پڑھنے والوں کو اپنی رضا اور بخشش کا اعلان سناتے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب عید کی صبح ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو زمین پر بھیجتے ہیں۔ وہ زمین پر اتر کر گلیوں اور راستوں کے کناروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایسی آواز سے جس کو جنوں اور انسانوں کے علاوہ ہر مخلوق سنتی ہے پکارتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت! اس رب کریم کی طرف چلو جو بہت زیادہ عطا فرمانے والا ہے اور بڑے بڑے قصور (گناہوں) کو معاف فرمانے والا ہے۔

پھر جب لوگ عیدگاہ کی طرف نکلتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے دریافت فرماتا ہے۔ کیا بدلہ ہے اس مزدور کا جو اپنا کام پورا کر چکا ہو؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ ہمارے مالک! اس کا بدلہ یہی ہے کہ اس کی مزدوری پوری پوری دی جائے۔ تب اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اے فرشتو! میں تمہیں گواہ بناتا ہوں میں نے ان کو رمضان کے روزوں اور تراویح کے بدلے میں اپنی رضا اور بخشش عطا کر دی۔

پیارے بچو! جب آپ عیدگاہ سے عید کی نماز پڑھ کر لوٹتے ہیں تو بے حد ثواب اور انعام حاصل کر کے اور گناہ معاف کروا کے لوٹتے ہیں۔

عید کے دن جب آپ خوشیاں مناتے ہیں، اپنے دوست احباب سے ملتے ہیں تو اپنے اُن دوستوں اور تعلق داروں سے بھی ضرور ملیے جن سے آپ کی رنجش ہے، آپ کا دل کی کدورتوں کو صاف کر کے ان سے ملنا اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کو بڑا اجر عطا کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔

عید کا مقصد صرف یہ نہیں کہ عمدہ کپڑے پہن لیے جائیں یا اچھی چیزیں کھائی جائیں بلکہ عید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کی جائے، بُری باتوں کو چھوڑا جائے، دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، فقراء اور مساکین کا خیال رکھا جائے۔عید مناتے ہوئے آپ ان باتوں کا خیال رکھیں گے تو عید کا مزا دوبالا ہو جائے گا۔

☆☆☆

جشنِ آزادی

آؤ بچو! آزادی کا مل کر جشن منائیں ہم
پاک وطن سب کچھ ہے اپنا ، اس کی شان بڑھائیں ہم
آزادی ہے نعمت رب کی، اس کی قدر کریں گے ہم
اپنی آزادی کی خاطر جئیں گے اور مریں گے ہم
چاہت اور اخوت کے ہم دیے جلائیں گھر گھر میں
بغض مٹا کر پیار کی خوش بو کو پھیلائیں گھر گھر میں
اسوۂ احمد ﷺ کو اپنا کر دین کا اُونچا علم کریں
جو باغی ہو پاک وطن کا اُس کے سر کو قلم کریں
جان و دل سے کریں حفاظت اپنے پیارے وطن کی سب
غفلت میں یکسر ہے خسارا ہے ، یہ تقاضا وقت کا اب
ستائیس رمضان کو رب نے ہم کو بخشی آزادی
ملا جو ہم کو پاک وطن تو ہو گئی حاصل دلشادی
ماہِ رواں میں ہم کو حق نے کتنی خوشیاں بخشی ہیں
رمضاں کی برکت سے دیکھو، ساری فضائیں مہکی ہیں
اِسی مہینے میں عید آئی ، خوشی سے ہر پَل مہکا ہے
دلوں میں سب کے پیار کی خوش بو ، گلشن سارا لہکا ہے
ہر اِک لب پر شکر خدا کا ، اس کے آگے سر خم ہیں
پاک وطن میں خوش ہیں ہم سب، دُور دلوں سے سب غم ہیں

ضیاء الحسن ضیا

پاکستان زندہ باد

علی اکمل تصور

ایک عجیب سی صورت حال تھی۔ عزیز کے ہاتھ میں ہزار، ہزار روپے والے پانچ نوٹ دبے ہوئے تھے۔ اور اُسے صرف تین الفاظ کہنے تھے۔ اور پھر یہ رقم اُس کی ہو جاتی۔ لیکن......لیکن......لیکن...... یہ لیکن اُسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ بات صرف تین الفاظ کہنے کی نہیں تھی۔ ان تین الفاظ میں ایک پوری داستان تھی۔ ایسی داستان جس کی ہار اور جیت کا فیصلہ یہ تین الفاظ ہی کر سکتے تھے۔

دولت میں طاقت ہوتی ہے۔ اس طاقت کی ایک حد ہوتی ہے، لیکن شعور کی طاقت ہر حد سے بالاتر ہوتی ہے۔ آج اُس طاقت کا امتحان تھا۔ آج عزیز کے ضمیر کا امتحان تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ عزیز کو روپوں کی ضرورت نہیں تھی۔ ضرورت تھی، بہت ضرورت تھی۔ رمضان کا مہینہ نصف گزر چکا تھا۔ عید آنے والی تھی۔ ہر سال عید عزیز اور اُس کے گھر والوں کو خوشی سے زیادہ محرومی کا احساس دے کر جاتی تھی، لیکن اس سال ایسا ہو سکتا تھا کہ اُن کے آنگن میں عید اپنی تمام تر مسرتوں کے ساتھ اترتی۔ گھر کے تمام افراد نئے لباس اور جوتے پہنتے۔ چاند رات کو وہ اپنی بہنوں کو چوڑیاں اور مہندی دلواتا۔ اور عید والے دن مزے دار سویاں اور فروٹ چاٹ کے علاوہ گھر میں اچھا کھانا بنتا۔ ساری تو نہیں لیکن کچھ خواہشیں ضرور پوری ہو سکتی تھیں۔

اس کے اردگرد ایک دائرے کی شکل میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ اس ہجوم میں چند غیر ملکی بھی تھے۔ جنہوں نے عزیز کو روپے دکھا کر مشکل میں ڈال دیا تھا۔ ان غیر ملکیوں کا ایک ساتھی پاکستانی تھا۔ اس کا نام اشفاق تھا۔ اُس کے گھر والے تو پاکستان میں رہتے تھے، لیکن وہ ملازمت کے سلسلے میں بیرونِ ملک مقیم تھا۔ اور آج تین سال کے بعد اپنے کام کے سلسلے میں اُس کی وطن واپسی ہوئی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ کام کے ساتھ ساتھ اُسے اپنے گھر والوں سے ملنے کا موقع بھی مل گیا تھا، لیکن ابھی وہ اپنے گھر نہیں گیا تھا۔ اُسے پہلے اپنا کام مکمل کرنا تھا۔

دو دن پہلے کی بات ہے۔ وہ اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ اُس کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ وہ چونک اٹھا۔ یہ یقیناً اُس ادارے کے سربراہ کا فون ہوگا جہاں وہ کام کرتا تھا۔ اُس کا اندازہ درست تھا۔ اُسے فوراً دفتر پہنچنے کی تاکید کی گئی تھی۔ ایک ضروری میٹنگ کے سلسلے میں اُسے بلایا گیا تھا۔ اگلے ایک گھنٹے میں وہ ساری بات سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اُس نے خوشی خوشی اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اور پھر وطن واپسی کا سفر شروع ہوا۔ پانچ غیر ملکی بھی اُس کے ساتھ تھے۔ یہ اُس کے دوست تھے اور اُس کے ساتھ کام کرتے تھے۔

پھر وہ سب پاکستان پہنچ گئے۔ اشفاق بہت پُر جوش تھا جب کہ غیر ملکی گھٹن محسوس کر رہے تھے۔ وہ صرف اپنا کام مکمل کرنے آئے تھے، لیکن اشفاق کی بات دُوسری تھی۔ ہوائی جہاز ائیر پورٹ پر اترا تو اشفاق نے پاک سرزمین پر اپنا سر رکھ دیا۔ اُس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ اور وہ کہہ رہا تھا۔

''اے میرے پاک وطن...... مجھے معاف کر دینا۔ میں تجھے بھولا نہیں ہوں۔ بس روزی کی تلاش مجھے تم سے دُور لے گئی ہے۔ لیکن میں جلد ہی لوٹ آؤں گا......''

اُس کے غیر ملکی ساتھی سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، لیکن انہیں حیرت اس بات پر تھی کہ وہ رو کیوں رہا ہے۔

پھر ایئر پورٹ سے ہی ان کے کام کا آغاز ہو گیا۔ یہ کام فلاح کے نام پر کیا جا رہا تھا، لیکن اس کام میں فلاح کا عنصر کم اور مکاری کا عنصر زیادہ تھا۔

اشفاق اور اُس کے ساتھی الیکٹرونک میڈیا سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک غیر ملکی خبروں کے چینل کے لیے کام کرتے تھے۔ اس چینل کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ وہ مکمل طور پر ایک سیاسی چینل تھا۔ یہ غیر ملکی حکومت ظاہری طور پر تو پاکستان سے محبت کا دم بھرتی تھی، لیکن تصویر کا دُوسرا رُخ کچھ اور ہی تھا۔ اپنے سیاسی مقاصد پورے کرنے کے لیے یہ حکومتِ وقت کو استعمال کرنے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ کبھی روپے کے لالچ پر تو کبھی طاقت کے زور پر۔ اور اب ایک خاص پیغام حاصل کرنے کے لیے اس غیر ملکی خبروں کے چینل کو استعمال کیا جا رہا تھا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ پاکستان کے لوگ اس غیر ملکی طاقت کے حوالے سے کیا رائے رکھتے ہیں۔ اشفاق کے غیر ملکی ساتھی پاکستان میں ایک دستاویزی فلم تیار کرنے آئے تھے اور اشفاق کا کام یہ تھا کہ وہ اُردو زبان کا انگلش اور انگلش زبان کا ترجمہ اُردو میں کرے گا۔

اپنی دستاویزی فلم کی تیاری کا سلسلہ انہوں نے ایئر پورٹ سے ہی شروع کر دیا تھا۔ دو کیمرے سارے مناظر فلما رہے تھے۔ مسافروں سے سوالات پوچھے جا رہے تھے۔ بات کا محور یہ تھا کہ غیر ملکی حکومت کے متعلق آپ کیا رائے رکھتے ہیں۔ جو آپ کی حکومت کی مالی مدد کرتی ہے، اپنی حکومت کے متعلق آپ کیا سوچتے ہیں اور آپ کی زندگی کے حالات کیا ہیں؟

دستاویزی فلم کی تیاری میں ان غیر ملکیوں کو بھرپور کامیابی مل رہی تھی۔ کیوں کہ لوگ بغیر سوچے سمجھے ان کو اپنے حالات سے آگاہ کر رہے تھے۔ بجلی نہیں ہے، پانی نہیں ہے، روزگار نہیں ہے، دہشت گردی کا سامنا ہے۔ لوگوں کی باتیں سن کر اشفاق کو شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا، لیکن اسے اپنا کام کرنا تھا۔ اُسے سوالوں کے جوابات تو لینے ہی تھے۔ اُس کے غیر ملکی ساتھی مسکرا رہے تھے۔ جانے کیوں اشفاق کو محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ اس کا تعلق پاکستان کے ساتھ ہونے کی وجہ سے مسکرا رہے ہیں۔ پھر اُن کی نظریں عزیز پر جا کر ٹھہر گئیں۔ عزیز فٹ پاتھ پر بیٹھا تھا۔ وہ متلاشی نظروں سے ہر آنے جانے والے کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں بوٹ پالش کرنے والا برش تھا۔ ہر گزرنے والے پر اُسے گمان ہوتا تھا کہ وہ اُس سے اپنا جوتا پالش کروائے گا۔ وہ ہر راہ گیر کو دیکھ آواز لگاتا تھا۔

''بوٹ پالش، صاحب...... بوٹ پالش......''

دستاویزی فلم بنانے کے حوالے سے دونوں کیمرے اب عزیز پر آ کر ٹھہر گئے تھے۔ پھر تھامسن نے اشفاق کے کان میں کچھ کہا۔ تھامسن اس ٹیم کا انچارج تھا۔

''نو سر...... نو سر......'' اشفاق چیخ اٹھا۔ اُن کے تمام ساتھی حیران رہ گئے تھے۔ اشفاق نے ایسے رویے کا مظاہرہ پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ تھامسن نے ہزار، ہزار روپے والے پانچ نوٹ اشفاق کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ پاکستان کی کرنسی اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ اب وہ حکم دینے والے انداز میں اشفاق سے کہہ رہا تھا کہ میں جو کہہ رہا ہوں اُس پر عمل کرو۔ اشفاق نے ایک بار پھر انکار کے انداز میں سر ہلا دیا۔

''میں ایسا نہیں کر سکتا...... اس میں میرے ملک کی توہین ہے......'' اشفاق کے لہجے میں تلخی تھی۔

''اگر تم نے میری بات پر عمل نہیں کیا تو واپس جا کر میں انتظامیہ سے تمہاری شکایت کروں گا اور تمہیں نوکری سے نکلوا دوں گا......''

تھامسن کی یہ دھمکی کام کر گئی۔ اور پھر پانچ ہزار روپے پکڑے اشفاق مردہ قدموں سے عزیز کی طرف بڑھا۔ وہ احمقوں کی مانند یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا، لیکن کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ عزیز کے پاس پہنچ کر اشفاق نے اس کا نام پوچھا، اپنا نام بتایا اور پھر پانچ ہزار کی رقم اُسے تھما دی۔

''پاکستان زندہ باد...... پاکستان زندہ باد......''
یہ نعرہ سن کر لوگ ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ اب چہار سُو ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔
''پاکستان زندہ باد...... پاکستان زندہ باد......''
عزیز نے ہزار ہزار روپے کے پانچ نوٹ تھامسن کے منہ پر دے مارے تھے۔
''میں غریب ہوں، لیکن مجھے اپنے بزرگوں کی قربانیوں کا احساس ہے......'' عزیز کے لہجے میں جوش تھا۔ اور پھر سب کے کانوں سے کسی کے ہنسنے کی آواز ٹکرائی۔ یہ اشفاق تھا۔ وہ اتنا ہنسا، اتنا ہنسا کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
''دیکھا تم نے، دیکھا تم نے......'' اشفاق تھامسن سے کہہ رہا تھا۔
''یہ نوجوان میرے پاک وطن کا مستقبل ہے۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ پاکستان کے لوگ جانے کس مٹی سے بنے ہیں۔ یہ ہر قسم کے حالات میں سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ آج مجھے اس سوال کا جواب ملا ہے۔ اس ملک کی بنیادوں میں شہیدوں کا لہو شامل ہے۔ میں بزدل تھا، میں مفاد پرست تھا، لیکن ہماری نوجوان نسل بزدل نہیں ہے، مفاد پرست نہیں ہے۔ یہ نسل میرے پاک وطن کی تعمیر کرے گی، تم دیکھنا تھامسن...... تم دیکھنا تھامسن!'' اشفاق نے عزیز کے بال پیار سے سہلائے اور پھر ایک سمت میں چل پڑا۔
''اشفاق کہاں چل دیئے؟'' اُس کے ایک ساتھی نے آواز لگائی۔
''میں گھر جا رہا ہوں، اپنے گھر، اگر تم لوگوں میں اخلاقی جرأت ہے تو ساری دُنیا کو پاکستان زندہ باد کا یہ نعرہ دکھانا......''
تھامسن پھٹی پھٹی آنکھوں سے اشفاق کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا، وہ اُسے روکنا چاہتا تھا، لیکن روک نہیں سکتا تھا کیوں کہ تھامسن سمجھ گیا تھا کہ اب اشفاق نہیں رُکے گا۔ اُس نے بوٹ پالش کرنے والے ایک لڑکے سے غیرت اور حمیت کا سبق جو سیکھ لیا تھا۔
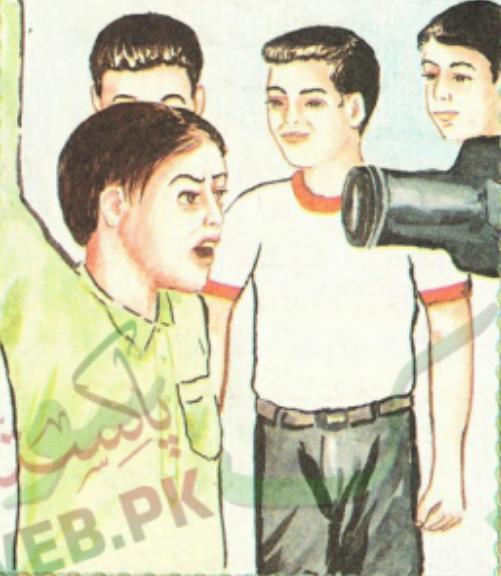
☆......☆......☆

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' عزیز نے زندگی میں پہلی بار پانچ ہزار روپے اکٹھے دیکھے تھے۔
''مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' عزیز نے دوبارہ پوچھا۔
''بیٹا...... تمہیں ایک نعرہ لگانا ہے......'' اس بار اشفاق کے ہونٹ کپکپائے۔
''تمہیں جس ملک کا نام بتایا ہے اُس کا نام لے کر ایک بار زندہ باد کا نعرہ لگانا ہے اور بس...... پھر یہ رقم تمہاری ہو جائے گی......''
اتنی بات کہتے کہتے اشفاق کا سر جھک گیا۔ پشیمانی اُس کے چہرے سے عیاں ہو رہی تھی۔ اور اب عزیز کا امتحان تھا۔ یہ رقم اچانک عزیز کے ہاتھ میں بہت وزنی ہوگئی تھی۔ پھر اُس نے ایک لمبا سانس بھرا۔ اب وہ نعرہ لگانے کے لیے تیار تھا۔ تھامسن کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ پاکستان کا یہ غریب لڑکا اس رقم کے بوجھ تلے اُس کے ملک کے حق میں نعرہ لگائے گا اور ضرور لگائے گا۔ اور پھر عزیز کی فلک شگاف آواز میں فضا میں گونجی۔

ہونہار مصور

جشنِ آزادی

ماہ نور مالک گورائیہ، گوجرانوالہ (پہلا انعام: 175 روپے کی کتب)

فرخندہ نواز، پشاور (دوسرا انعام: 150 روپے کی کتب)

یمنیٰ امجد، لاہور (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

اقصیٰ نورین، گجرات (چوتھا انعام: 100 روپے کی کتب)

سیدہ جویریہ شاہ، واہ کینٹ (پانچواں انعام: 90 روپے کی کتب)

عائشہ ملک، میاں والی (چھٹا انعام: 75 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: محمد عبداللہ بن ظفر، شہر بانو نعیم، اشفاق احمد، آفتاب عدیل، ردا، مناہل، عدیل، لاہور۔ سید دارین حسین زیدی، سیدہ دُعا بتول، شیخوپورہ۔ نزل سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ حمیرا ممتاز، نوشہرہ۔ عائشہ صدف، میاں والی۔ لیلیٰ تنویر، چکوال۔ عائشہ شہزاد، فیصل آباد۔ تہنیت شفقت، لاہور۔ جویریہ رحمٰن رانا، کلورکوٹ۔ ثناء جمال، شہزاد صغیر، ثمرن عظیم، اسلام آباد۔ محمد توقیر قاسم، خوشاب۔ صباء ناز، گوجرانوالہ۔ سید زین العابدین شاہ، رحیم یار خان۔ زبیر جمشید، خانیوال۔ مریم نعیم، سرگودھا۔ محمد تیمور حیدر، سانگلہ ہل۔ جویریہ یونس، لاہور۔ لائبہ مہرین، عبداللہ رحمٰن، فیصل آباد۔ محمد شعیب خالد، گوجرہ۔ زین احمد قریشی، سانگلہ ہل۔ عروج فاطمہ، راول پنڈی۔ مقدس اسلم، بھلوال۔ اسجد احمد، امبر آفتاب، ایبٹ آباد۔ عبداللہ آصف، اسلام آباد۔ مریم حبیب، رائے ونڈ۔ رابعہ وسیم، امیر حمزہ اصغر، سیال کوٹ۔ حذیفہ الطاف، کراچی۔ عائشہ ادریسی، علی پور۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

ستمبر کا موضوع: پاکستانی جنگی جہاز — آخری تاریخ 8 اگست

اکتوبر کا موضوع: میری گڑیا، پیاری گڑیا — آخری تاریخ 8 ستمبر

ڈاکٹر عمران مشتاق

دادا جان کی عیدی

عید کی آمد آمد تھی اور رضوان کو دادا جان کی یاد بہت ستا رہی تھی۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اُس نے اپنے دادا جان کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ امی کا کہنا تھا کہ وہ رضوان کی پیدائش سے بہت پہلے اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے تھے۔ رضوان کو اُن کا بہت انتظار تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں چلے جاتے ہیں وہ اپنے کام نمٹا کر کچھ وقت گزرنے کے بعد واپس آجاتے ہوں گے۔ نہ جانے دادا جان کے وہ کون سے کام تھے جو ختم ہونے میں ہی نہیں آتے تھے۔ وہ جب امی سے پوچھتا تو اُس کی چھوٹی عُمر کو دیکھتے ہوئے وہ اُسے باتوں سے بہلا دیتیں۔ جب سے اُسے پتہ چلا تھا کہ اُس کے دوستوں اسد اور عبداللہ کے دادا جان عید منانے اُن کے پاس آ رہے ہیں تو اُس کی بے تابی اور انتظار کی شدت بہت بڑھ گئی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ ایک دن وہ سو کر اُٹھے گا تو دادا جان گھر آ چکے ہوں گے۔

☆☆☆

وہ عید کارڈ اُس نے سکول کے بک اسٹال سے خریدا تھا۔ پہلے تو اُس کا خیال تھا کہ دادا جان کو خط لکھا جائے پھر عید کی مناسبت سے اُسے عید کارڈ زیادہ بہتر لگا کہ عید کے حوالے سے دادا جان یقیناً اُسے اہمیت دیں گے اور اپنی مصروفیت کم کر کے آنے کی پوری کوشش کریں گے۔ اُس نے لکھا تھا۔

پیارے دادا جان!

السلام علیکم!
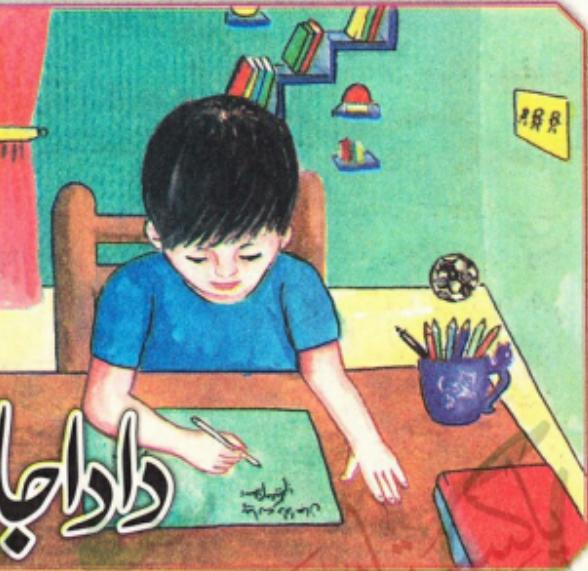
کیا آپ اللہ تعالیٰ کے ہاں جا کر اتنے مصروف ہو گئے ہیں کہ اپنے ننھے پوتے رضوان کو بھی بھول گئے ہیں۔ وہ رضوان جو آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔ پلیز اس عید پر گھر ضرور آئیں اور یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے کہ میرے لیے عید کے اچھے اچھے تحفے لانا نہ بھولئے گا۔ آنے سے پہلے اطلاع ضرور دیجئے گا تا کہ میں عبداللہ اور اسد کو بتا سکوں۔ میری لکھائی اتنی اچھی نہیں اور میں ابھی چھوٹا بھی بہت ہوں مگر ابو کہتے ہیں کہ میں بہت ذہین ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اتنے بڑے ہیں اس لیے میرا عید کارڈ ضرور پڑھ لیں گے اور فوراً ایکشن بھی لیں گے۔

آپ کا بہت پیارا پوتا
رضوان علی

☆☆☆
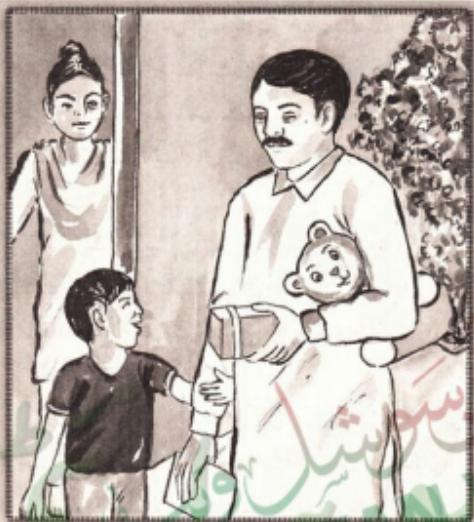
رمضان کا بابرکت مہینہ رخصت ہو چکا تھا اور آج عید کا دن تھا۔ رضوان اپنے ابو کے ساتھ عید کی نماز پڑھ کر گھر آ گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ابو اپنے دوستوں سے عید ملنے کے لیے چلے

گئے تو وہ امی کے ساتھ گھر میں اکیلا رہ گیا۔ دوپہر کا وقت ہوگا جب بیرونی دروازے کی گھنٹی بجی۔ رضوان کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ دروازے کی جانب لپکا۔ اُسے دروازہ کھولنے کی اجازت نہ تھی، مگر اُس دِن اُس نے کوئی پروا نہ کی۔ دروازے پر ایک سفید بالوں والے بوڑھے سے آدمی کھڑے تھے۔ رضوان کو لگا کہ جیسے اُس نے اُنہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

''آپ --- آپ --- میرے دادا --- جان --- ہیں نا؟'' وہ بے تابی سے پوچھنے لگا۔

''وہ --- بیٹا میں دراصل ---'' وہ ہچکچاتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کر رہے تھے کہ امی آ گئیں۔

''رضوان دروازے پر کون ہے؟ میں نے تُم سے کتنی بار کہا ہے کہ باہر کا دروازہ نہ کھولا کرو یہ بڑوں کا کام ہے۔'' امی اُسے تنبیہ کرتے ہوئے بیرونی دروازے تک چلی آئیں۔

''میں نے کسی اور کے لیے دروازہ تھوڑی کھولا ہے، یہ تو میرے دادا جان ہیں اور ہمیں سرپرائز دینے کے لیے عید کے دِن آئے ہیں۔'' رضوان اُن کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔

''دادا جان --- دادا جان --- یہ تُم کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ حیرت سے دونوں کو تکتی رہ گئیں۔

''خود ہی دیکھ لیجیے۔ یہ آپ کے سامنے ہیں۔'' اُس کے انداز سے فخر کا احساس جھلک رہا تھا۔

''اوہ آپ ہیں نواز صاحب۔'' امی نے پوسٹ مین نواز صاحب کو پہچان کر سکون کا سانس لیا۔

''آپ نہیں نواز صاحب کیوں کہہ رہی ہیں۔ ابا میاں کہیں نا۔'' رضوان نے اصرار کیا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ تم ایسا کرو۔ ذرا اندر جا کر میرا بیگ لے آؤ۔ مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔'' وہ جانتی تھیں کہ عید پر پوسٹ مین، محلے کا چوکی دار اور صفائی کرنے والا اپنی عیدی لینے ضرور آتے ہیں۔

''رضوان میرا بیگ لاتا ہے تو میں آپ کو عیدی دیتی ہوں۔'' وہ نواز صاحب سے نرم لہجے میں کہنے لگیں۔

''نہیں بیگم صاحبہ! میں عیدی کے لیے حاضر نہیں ہوا۔'' نواز صاحب نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کوئی چیز اُن کی جانب بڑھائی۔ ''ذرا یہ عید کارڈ ملاحظہ فرمائیں۔''

اُن کی نظر پتے پر پڑی تو وہ بے ساختہ مُسکرا دیں۔ وہ سات سالہ رضوان کی ناپختہ لکھائی سے خوب واقف تھیں۔ لفافے پر پتہ اُس نے یوں لکھا تھا: ''پیارے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ فرشتے کے ذریعے دادا جان کو ملے۔''

امی جان نے کارڈ کھول کر پڑھا تو اُن کے ماتھے پر سوچ کی لکیر اُبھر آئی۔ ان کا دھیان اِس بات کی طرف نہیں گیا کہ عید کارڈ کا لفافہ پہلے سے کُھلا ہوا تھا۔

''بیگم صاحبہ! رضوان ایک پیارا بچہ ہے اور یقیناً اپنے دادا جان سے بے حد محبت کرتا ہے۔ میں اُس کے لیے کُچھ چیزیں لایا تھا۔ میرا اپنا تو اِس دُنیا میں کوئی نہیں۔ میں اُس کا دادا تو نہیں ہوں اور نہ ہی بن سکتا ہوں، لیکن اگر وہ اِس سے بہل سکتا ہو تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ میں اپنی حیثیت سے واقف ہوں اور اِس قابل بھی نہیں۔ بس پھر بھی ---'' نواز صاحب بھرائے ہوئے لہجے میں سارا مدعا بیان کر گئے۔

امی جان نے دیکھا کہ نواز صاحب کی بغل میں ایک پیارا سا

بھالو دبا ہوا تھا اور ہاتھ میں ایک ریموٹ کنٹرول سے چلنے والی کھلونا کار تھی۔وہ خود عید کے نئے کپڑوں میں ملبوس تھے۔نواز صاحب اچھی شہرت کے مالک تھے۔ وہ ڈاک کے محکمے کے دُوسرے ملازمین سے مختلف انسان تھے اور اپنا کام بڑی ذمہ داری سے انجام دیتے تھے۔

"امی ایک تو آپ اپنی چیزیں نہ جانے کہاں رکھ دیتی ہیں۔مجھے آپ کا بیگ ڈھونڈنے میں اتنی دیر لگ گئی ہے۔"رضوان بھاگتا ہوا واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں اُن کا بیگ دبا ہوا تھا۔

"وہ بیگم صاحبہ!"

"ارے یہ آپ امی کو بیگم صاحبہ کیوں کہہ رہے ہیں۔" نواز صاحب کے مُنہ سے "بیگم صاحبہ" کا سن کر رضوان حیران رہ گیا تھا۔

"آپ کو کہنا چاہئے اری بہو! جیسے اسد کے دادا جان اُس کی امی جان کو کہتے ہیں۔چھوٹی بہو اسد کا بہت خیال رکھا کرو وہ بہت پیارا بچہ ہے۔آپ کہہ سکتے ہیں کہ بہو رضوان بہت ہی پیارا بچہ ہے اور پھر اکلوتا بھی ہے اِس کا بہت زیادہ خیال رکھا کرو۔"
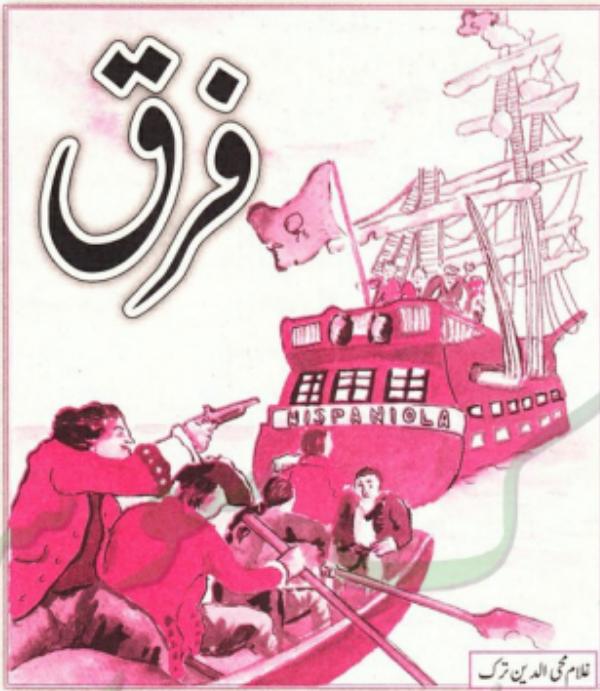
رضوان کے معصوم انداز نے امی اور نواز صاحب کو بے ساختہ مُسکرانے پر مجبور کر دیا۔

"ارے کیا تم دادا جان کو اتنی دیر تک دروازے پر ہی کھڑے رکھو گے یا اندر بھی بُلاؤ گے۔"نواز صاحب نے بیگم صاحبہ کی بات کو سن کر بڑی کوشش سے تیزی سے اُمڈتے آنسوؤں کو روکا۔اُن کی پُرنم آنکھوں سے تشکر جھلک رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد رضوان "اپنے دادا جان" سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ وہ اپنے تحائف پا کر مسرت سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔

امی اُنہیں کھیلتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں۔ "بچوں کو حقیقت سے آگاہ کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔اُنہیں جھوٹ موٹ بہلا دینے سے کام نہیں چلتا۔بچوں کو جب سچائی کا سامنا کرنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ اُنہیں بتدریج اُس کے لیے تیار کیا جائے تاکہ نہ تو وہ تاریکی میں رہیں اور نہ ہی اُنہیں اچانک کسی صدمے سے دوچار ہونا پڑے۔"

اُدھر رضوان سوچ رہا تھا کہ یہ کتنی اچھی بات ہے کہ اُس کے دادا جان پوسٹ مین ہیں یعنی وہ اُس سے ملنے کے لیے اکثر آ سکتے ہیں جب کہ اسد اور عبداللہ کے دادا جان تو سال میں ایک آدھ بار ہی آتے ہیں۔رضوان کی عید دادا جان کی وجہ سے یادگار ہو گئی تھی۔دادا جان جاتے جاتے اُسے عیدی کے طور پر پانچ سو روپے دے گئے تھے۔وہ امی کو دادا جان کی عیدی کے بارے میں خوشی کے عالم میں بتائے جا رہا تھا اور وہ حیرت سے رضوان کے ہاتھ میں دبے پانچ سو کے نوٹ کو دیکھ رہی تھیں۔امی جان نے نواز صاحب کو عیدی دینی چاہی تھی مگر انہوں نے عیدی لینے سے انکار کر دیا تھا۔

☆☆

سلسلہ "کھوج لگائیے" میں ان بچوں کے جوابات بھی درست تھے

طوبیٰ یوسف، آمنہ اکرام، حراء تعبیر، صائم فرید، علینہ جمشید، اقراء خان، ام فروہ علی، آمنہ زاہد، محمد ابوبکر رمضان، محمد عزیر، محمد فیضان، حمنہ رؤف، احسن بشیر، علی عمران، شافعیہ ریحان، جویریہ زرتاج، عبدالباسط، لاہور۔ یسال رحمت، محمد انس الیاس، ایمن الیاس، محمد سمیر، مومن نعیم، نرمین ایاز، سارہ امیر، راول پنڈی۔ محمد اشمار علی، گوجرانوالہ۔ زینب سحر، مزمل حسین غوری، بہاول پور۔ لاریب جمیل، جڑانوالہ۔ حسن علی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ مسکان، فیصل اعوان۔ سویرا ادریس احمد، پشاور۔ سعد خالد ظفیر، قلعہ دیدار سنگھ۔ سید زین العابدین، خان پور۔ عبدالرشید اعوان، اٹک۔ ثانیہ زینب، قصور۔ حمزہ خالد، آزاد کشمیر۔ عاقب سفیان، بھکر۔ محمد شایان، اسد واحد، مریم زبیری، اسلام آباد۔ کائنات حسین، تحریم ثاقب، محمد سعد، محمد عثمان ظفر، وقاص شوکت، فیصل آباد۔ عزیز احمد، صدیقہ ناز، نوشہرہ۔ ماہ نور تواب، ملتان۔ زینب خالد، جہلم۔ طوبیٰ احمد، ڈیرہ غازی خان۔ مریم صدیقہ، محمد اکرم، گوجرانوالہ۔ مریم نعیم، سرگودھا۔ حاشر احمد، محمد وحید، راول پنڈی۔ زارا ندیم، بہاول پور۔ ماہین زبیر، گوجر خان۔ آمنہ عمران، فیصل آباد۔ ایمن فاروق، حیدر آباد۔

فرق

غلام محی الدین ترک

شرما ایک شپنگ کمپنی میں ملازمت کرتا تھا، روزی کمانے کے لیے اُسے ملکوں، ملکوں گھومنا پڑتا تھا۔ اس بار اس کی منزل انگلستان تھی۔ اس جہاز میں اس کے علاوہ مختلف ملکوں کے تیس اور مسافر بھی سفر کر رہے تھے۔ جن میں چار پاکستانی، چھ اس کے ہم وطن، باقی دُوسرے ملکوں کے لوگ تھے۔ اُس نے جہاز میں جب پاکستانیوں کو دیکھا تو انہیں دیکھتے ہی منہ پھیر لیا۔

''ہونہہ، یہ یہاں بھی آ گئے۔'' اس نے نفرت سے منہ سکیڑا۔

جہاز کو کچھ ماہ تک سفر کرنا تھا، شرما کا جب بھی پاکستانی مسافروں سے سامنا ہوتا، وہ ان سے کھچا کھچا سا رہتا۔ وہ پاکستانیوں سے بچپن ہی سے نفرت کیا کرتا تھا۔ جہاز اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا کہ اچانک پچھلی طرف سے آنے والے بحری قذاقوں کے ایک جہاز نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔ جہاز کے کپتان نے بچ نکلنے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ تھوڑی دیر بعد سارے مسافر ڈاکوؤں کی قید میں تھے۔ سب مسافروں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

بحری ڈاکوؤں نے آتے ہی سب مسافروں کو رسیوں سے جکڑ لیا تھا۔ مسافروں کی جان پر بن آئی تھی۔ ڈاکو ان کی زبان نہیں سمجھتے تھے، ان کے صرف ایک ساتھی کو انگریزی آتی تھی، وہی ڈاکو کیپٹن شارق کے پاس آیا۔

''سردار نے آپ لوگوں کی رہائی کے لیے پچاس کروڑ طلب کیے ہیں۔''

''کیا؟ پچاس کروڑ۔'' کیپٹن شارق کا اتنی رقم سنتے ہی منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''مگر اتنی رقم ہم کیسے دے سکتے ہیں؟'' کیپٹن شارق کی یہ بات ڈاکو نے سردار کو بتائی تو وہ تیز تیز چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔ اس کا اندازہ بتا رہا تھا کہ اسے کیپٹن کی بات ناگوار گزری ہے۔ اس بات کا ثبوت بھی فوراً ہی مل گیا جب اس نے آتے ہی ایک زناٹے دار تھپڑ کیپٹن کو رسید کیا۔ کیپٹن کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔

سردار کی نظریں کیپٹن پر تھیں اور وہ اسے خوں خوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کئی لمحے یوں ہی گزر گئے۔ سب مسافر مکمل طور پر ان ڈاکوؤں کے رحم و کرم پر تھے۔ ''اچھا میں کوشش کرتا ہوں۔'' سردار نے یہ سن کر سر ہلایا اور وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی کیپٹن نے اطمینان کا سانس لیا اور رقم کے بارے میں سوچنے لگا۔

☆☆☆

امامہ کمرے میں بیٹھی کام کر رہی تھی کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ جب بھی یہ گھنٹی سنتی تو خوش ہو کر تالیاں بجانے لگتی۔ وہ جانتی تھی کہ فون اُس کے پیارے ابو کا ہو گا۔ وہ بھاگ کر فون کے پاس پہنچی۔

''السلام علیکم ابو! آپ کیسے ہیں؟''

''وعلیکم السلام بیٹی! میں ٹھیک ہوں۔'' دوسری طرف سے جواب سنتے ہی اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

''ابو! آپ کی آواز کو کیا ہوا، آپ ٹھیک طرح سے کیوں نہیں بول رہے۔'' امامہ ان کی آواز سنتے ہی پریشان ہوگئی۔

''میں ٹھیک ہوں، تم فکر نہ کرو، اپنی امی کو بلاؤ۔'' امامہ بھاگ کر امی کو بلا لائی۔ کیپٹن شارق نے ساری صورت حال انہیں بتائی تو وہ پریشان ہوگئیں۔

''آپ حوصلہ رکھیں، میں کچھ کرتی ہوں۔''

''اتنی رقم کا بندوبست کیسے ہوگا'' انہوں نے کہا۔

امامہ نے جب یہ سنا کہ اس کے ابو ڈاکوؤں کی قید میں ہیں تو وہ بے ساختہ رونے لگی۔ امی نے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ امامہ اکثر ٹی وی پر ڈاکوؤں کو دیکھتی رہتی تھی، اسے معلوم تھا کہ ڈاکو بہت خوف ناک ہوتے ہیں۔ ڈاکوؤں کے حکم پر سب مسافر اپنے گھر والوں کو فون کر رہے تھے۔ امی نے پیسوں کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیئے۔ امامہ نے بڑی سمجھ داری دکھائی۔ اُس نے اپنا جیب خرچ لینا بھی بند کر دیا۔

''امی! کیا ابو اس بار رمضان میں ہمارے ساتھ نہیں ہوں گے۔'' امامہ نے رمضان کا چاند دیکھتے ہوئے پوچھا تو امی نے بے ساختہ اسے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

''تم دُعا کرو، وہ جلد از جلد ہمارے درمیان خیریت سے آ جائیں، بچوں اور روزہ داروں کی دُعائیں رد نہیں ہوتیں۔'' ننھی امامہ نے بے ساختہ اپنے ہاتھ دُعا کے لیے اٹھا دیئے۔ امی کی یہ بات اس نے گرہ سے باندھ لی اور رمضان کے روزے رکھنا شروع کر دیئے۔ پچھلے سال اس کی روزہ کشائی تھی، وہ جس عمر کی بچی تھی، اس میں بچے عموماً پورے روزے نہیں رکھتے، مگر اب تک اس نے سارے روزے رکھے تھے۔ امی نے اُسے یہ بھی بتایا تھا کہ افطار کا وقت دُعا کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے، امامہ بڑے اہتمام سے اس وقت دُعا مانگا کرتی تھی۔

رمضان کا آخری عشرہ آ چکا تھا، کچھ دنوں بعد عید آنے والی تھی۔ امامہ کی بے چینی میں اضافہ ہو چکا تھا۔

''امی! ابو عید تک تو آ جائیں گے ناں ہمارے پاس۔''

''ان شاء اللہ'' امی جان بولیں۔

☆☆☆

جہاز کے مسلمان مسافر روزے رکھ رہے تھے۔ شرما کے لیے یہ مہینہ بڑا حیرت انگیز ہوتا تھا۔ اپنے ملک میں تو وہ یہ سمجھتا تھا کہ مسلمان اپنے گھروں میں ضرور چھپ کر کھاتے ہوں گے، مگر اب آنکھوں دیکھی حقیقت کو جھٹلانا اس کے لیے ممکن نہ تھا، وہ ان کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ سحری کے وقت تو وہ سویا ہوتا، مگر سارا دن انہیں کچھ کھاتے نہ دیکھ کر وہ سخت حیران ہوتا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر ساری دُنیا کے مسلمان ایک خاص وقت تک کیوں بھوکے پیاسے رہتے ہیں۔ اسے اس بات پر بھی حیرت ہوتی تھی کہ ڈاکو

انہیں کھانے کو بھی کم دیتے ہیں، دن بھر تکلیف میں بھی مبتلا کرتے ہیں۔ پھر بھی یہ لوگ کس طرح روزہ رکھتے ہیں۔

ایک روز دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ یہ بات کیپٹن شارق سے پوچھ بیٹھا تو وہ بولے:

''ہم مسلمان ہیں اور ہم پر ایک ماہ یعنی رمضان المبارک کے روزے فرض ہیں۔ ہم اللہ کے بندے ہیں اور اس کی نافرمانی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ روزہ رکھ کر ہمیں ایک خاص قسم کی لذت حاصل ہوتی ہے اور ہم خود کو بڑا پُرسکون محسوس کرتے ہیں۔'' کیپٹن شارق کی باتوں سے وہ خاصا متاثر ہوا تھا۔

شرما کو اپنے دادا کی باتیں یاد آئیں جو اس سے کہا کرتے تھے۔ ''کسی انسان کے لیے ایک سچے مسلمان کی دوستی سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں۔'' وہ اُسے اکثر اپنے دوست حامد کے بارے میں بتایا کرتے تھے جو تقسیم ہندوستان کے وقت پاکستان چلا گیا تھا کیوں کہ ہندوستان میں اس کا رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ شرما کے دل میں آہستہ آہستہ مسلمانوں سے نفرت کم ہو رہی تھی۔

☆☆☆

رمضان کا آخری روزہ بھی آ گیا۔ امامہ کی بے چینی عروج پر تھی۔

''امی! کل عید ہے اور ابو!'' وہ پورا جملہ نہ کہہ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''نہیں بیٹی! مت روؤ، اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتے۔'' امی نے اُسے دلاسہ دیا۔ عید پر امامہ اداس تھی۔ ہر عید پر وہ ابو کے ساتھ ڈھیروں خریداری کرتی، مگر اب اُسے کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ سکول میں بھی اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ امی نے اس کے لیے ایک سوٹ بنایا تھا۔ جسے اس نے امی کے اصرار پر بڑی مشکلوں سے پہنا تھا۔ اُسے زبردستی چوڑیاں بھی دلا دی تھیں۔

کیپٹن شارق کو قید ہوئے چھ ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا، مگر رقم کا بندوبست اب تک نہیں ہو سکا تھا۔ امامہ کی امی بھی خاصی فکر مند تھیں۔ ایک روز ٹی وی دیکھتے دیکھتے اچانک وہ چونکیں۔ ٹی وی پر ایک سماجی کارکن کے بارے میں بتایا جا رہا تھا جس نے ایک متاثرہ خاندان کی مدد کی تھی، وہ اُسے جانتی تھیں۔

اگلے روز وہ ان کے دفتر پہنچ گئیں۔ ان کا نام شعیب تھا، ساری تفصیلات سننے کے بعد کہنے لگے:

''بہن! فکر نہ کرو ایک روز کیپٹن شارق ہمارے ساتھ ہوں گے۔ ان شاء اللہ۔''

اچانک امی کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''ان ہی ڈاکوؤں کا فون آیا ہے۔''

''فون مجھے دیجیے، میں ان سے بات کرتا ہوں۔''

''السلام علیکم! کیا حال ہیں؟'' ابو نے کہا ہی تھا کہ اُن کی آواز بند ہو گئی۔

''اگر تم نے دو ماہ کے اندر اندر ہمیں پچاس کروڑ روپے نہ دیئے تو کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔'' فون پر ایک کرخت آواز سنائی دی، ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ آواز سنتے ہی انہیں جھٹکا لگا۔ صورت حال بڑی خوف ناک تھی۔ معاملہ ان کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ شعیب نے امی کو ایک بار پھر دلاسہ دیا۔

اب زیادہ تر فون شعیب کے پاس آتے تھے۔ شعیب نے کسی

طرح ڈاکوؤں کو آدھی رقم لینے پر آمادہ کر لیا تھا۔ ایک ٹی وی چینل نے پیسوں کے لیے لوگوں کو ترغیب دلانا شروع کر دی تھی۔ اس مہم میں امامہ بھی کھڑی تھی۔ لوگ آتے اور ڈبے میں پیسے ڈال دیتے، کچھ اسے دلاسہ بھی دے رہے تھے۔ ایک ننھا منا سا بچہ اس کے پاس آیا۔ وہ اپنے امی ابو کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے ابو نے اُسے پیسے تھمائے تو وہ امامہ کے پاس آ گیا۔

''امامہ بہن، فکر نہ کرو، تمہارے ابو بہت جلد آ جائیں گے۔ سب پاکستانی تمہارے ابو کے لیے دُعائیں مانگ رہے ہیں۔ وہ واپس ضرور آئیں گے۔'' امامہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ شعیب صاحب نے بچے کی باتیں سنیں تو انہوں نے بھی اپنے اندر ایک توانائی محسوس کی۔

کچھ ہی دنوں میں شعیب نے بیس کروڑ روپے جمع کر لیے تھے۔ شرما کے ایک ہم وطن نے بھی انہیں پانچ کروڑ روپے دینے کی پیش کش کی تھی، اور اب انہیں رقم پوری ہونے کی اُمید ہو چلی تھی۔ اب صرف ہندوستانی شہری کی رقم کا انتظار تھا۔ مہلت ختم ہو رہی تھی کہ وہ شخص رقم کی ادائیگی سے مکر گیا۔

امامہ نے یہ سنا تو بے ساختہ رو پڑی۔ منزل قریب آنے کے بعد پھر آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

''اب کیا ہوگا؟'' وہ سرخ آنکھیں لیے امی کے پاس بیٹھی تھی۔

''بیٹا! اللہ بڑا کارساز ہے۔ جہاں اتنی رقم جمع ہو گئی ہے، وہاں اور بھی ہو جائے گی، مگر اللہ کا شکر ہے کہ بھارتیوں کا اصل روپ سامنے آ گیا، اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے ہمیں پاکستان جیسی نعمت سے نوازا ہے۔'' امی جان نے امامہ کو تسلی دی۔

پیسے اکٹھے کرنے کی مہم کئی ماہ جاری رہی۔ آخر مقررہ رقم اکٹھی ہو گئی۔ رقم جمع ہونے کے فوراً بعد ڈاکوؤں کو ساری رقم دے دی گئی۔

پاکستان پہنچنے پر سارے مسلمان سجدۂ شکر ادا کرنے میں مصروف تھے۔ دس ماہ سے قید ان مسافروں کو چھڑوانے کے لیے پاکستان کے بڑے دل والوں نے پیسے دیئے تھے۔ کیپٹن شارق اور امامہ ایک دُوسرے کو دیکھ کر گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ انہیں دیکھ کر ہر آنکھ اشک بار تھی۔

شرما نے اپنے ہم وطنوں کی منافقت دیکھ لی تھی جنہیں انسانوں سے کوئی ہم دردی نہ تھی۔ اب اسے اپنے دادا کی بات کا یقین ہو چکا تھا کہ ایک انسان کے لیے سچے مسلمان کی دوستی سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں اور ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ صحیح تھا۔ اسے یہ بات بھی معلوم ہو گئی تھی کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں سب انسانوں سے محبت کی جاتی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر پاکستان کا قیام عمل میں نہ آتا تو...... آگے کچھ سوچ کر ہی اسے جھرجھری سی آ گئی تھی۔ وہ پاکستانیوں اور مسلمانوں سے دوستی کا فیصلہ کر چکا تھا، اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ ان کی طرف چل پڑا۔

☆......☆......☆

توجہ فرمائیے

''تعلیم و تربیت'' میں شامل انعامی سلسلوں میں آپ بھرپور حصہ لیتے ہیں۔ آپ میں سے اکثر بچے اپنا ڈاک کا مکمل پتہ نہیں لکھتے، جس کے باعث انعامی کتب آپ تک نہیں پہنچ پاتیں اور آپ یہی سمجھتے ہیں کہ ہم نے آپ کو انعامی کتب ارسال نہیں کیں۔ شمارہ مئی، جون اور جولائی 2012ء کے انعامی مقابلوں میں انعام حاصل کرنے والے درج ذیل بچوں کی کتب پتہ درست نہ ہونے کے باعث واپس آ گئی ہیں۔

مدثر کرم شہزاد، سرگودھا۔ ربیعہ اکرام، لاہور۔ محمد داؤد جان، راول پنڈی۔ عبداللہ سلیم، فیصل آباد۔

ایک اور نیا سلسلہ

''پیارے اللہ کے پیارے نام'' جی ہاں یہ ہے وہ نیا سلسلہ جس کا آغاز ستمبر کے شمارے سے ہوگا۔

اس سلسلے میں کیا کچھ ہوگا؟ یہ جاننے کے لیے اگلا شمارہ ضرور پڑھیے۔ یہ قابلِ قدر سلسلہ راشد علی نواب شاہ تحریر کریں گے۔

موبائل فون دورِ حاضر کی ایک اہم اور مفید ایجاد ہے۔ اس ایجاد کو جہاں اچھے انداز میں استعمال کیا جا رہا ہے وہاں اس کا بے جا استعمال بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ راہ گیر ہمیں آس پاس کی چیزوں سے بے نیاز موبائل فون پر باتیں کرنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں، طالب علم پڑھائی کے وقت بھی موبائل فون پر بے مقصد اپنے دوستوں سے گپ شپ کرتے رہتے ہیں، باغ میں سیر کے دوران بھی موبائل فون پر باتوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ڈرائیونگ کے دوران بھی موبائل فون استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسا کرنا دُرست بات نہیں۔ آیئے عہد کریں ہم سب موبائل فون جیسی مفید ایجاد کا بے جا استعمال نہیں کریں گے۔ جو بچے ایسا کرنے کا عہد کرتے ہیں اُن کے نام اگلے مہینے شائع کیے جائیں گے۔ اس عہد نامے میں شامل ہونے کے لیے کوپن ارسال کرنا ضروری ہے۔

شاباش

ان بچوں نے عہد کیا کہ اگر ان کے دوستوں میں کوئی کسی مضمون میں کم زور ہو گا تو وہ اس کی مدد کریں گے۔

حذیفہ خاور، زینب قریشی، ملتان۔ مہروش زہرا، واہ کینٹ۔ سرمد ملک، لاہور۔ محمد ثوبان میر، گوجرانوالہ۔ محمد حمزہ چکوال۔ ارتضیٰ امر، کندیاں۔ طیب طاہر، احمد فاروق، محمد نعیم امین، لاہور۔ قمر ناز دہلوی، کراچی۔ حافظ عبدالمتین چغتائی، ملتان۔ سائرہ جاوید، لاہور۔ زمین اعجاز، راول پنڈی۔ عائقہ عرفان، میجر محمد رضا، لاہور۔ ایمن رؤف، لاہور۔ ثمرین عظیم، اسلام آباد۔ محمد معید حیدر، راول پنڈی۔ نسیمہ فیاض، بہاول نگر۔ سیال رحمت، سحر اشفاق، واہ کینٹ۔ حمدہ فیصل، گوجرانوالہ۔ شبانہ نیاز، فیصل آباد۔ ایمن کائنات، ڈیرہ غازی خان۔ عبداللہ، لاہور۔ محمد شکیل، گوجرہ۔ معاذ خان، پشاور۔ محمد انتشال حسن، خوشاب۔ محمد عبدالحق، راول پنڈی۔ حافظ عمیر فہیم، حویلی لکھا۔ محمد حذیفہ علی، ملتان۔ مناہل امانت، گجرات۔ ایچ ایم سلیم نور، اوکاڑہ۔ صاحبزادہ خیال محمد، ڈیرہ غازی خان۔ مریم صدیقہ، گوجرانوالہ۔ معاذ احمد کندیاں۔ شافیہ ریحان، لاہور۔ تحریم زبیر، گوجر خان۔ اقراء خان، لاہور۔ عائشہ رحمٰن، لاہور۔ محمد عمار صدیقی، کراچی۔ محمد حسن رضا، جوہر آباد۔ ثمائلہ، محمد ضیاء اللہ، میاں والی۔ حسیب اشرف، لاہور۔ تحریم ظفر، اٹک۔ صباء ناز، گوجرانوالہ۔ ایمن وسیم، بنوں۔ سندس عمر، محمد حذیفہ الطاف، کراچی۔ راہبل بلوچ، تحریم فاطمہ، عائشہ رحمٰن، لاہور۔ محمد واصف، بہاول پور۔ شیزا اقبال، لاہور۔ محمد سعد اسد، میر پور۔

آیئے عہد کریں

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 اگست 2012ء ہے۔

نام ____________ مقام ____________

میں عہد کرتا/کرتی ہوں کہ ____________

____

____

مولانا محمد مظہر الدین

غلام حسین میمن

4 مارچ 1939ء کو سہ روز اخبار ''الامان'' کے مدیر مولانا محمد مظہر الدین کو دن دھاڑے ان کے دفتر میں قتل کر دیا گیا۔ یہ خبر آناً فاناً دہلی میں پھیل گئی۔ اُن کی نماز جنازہ جامع مسجد دہلی میں ادا کی گئی۔ سب حیران تھے کہ انہیں کس جرم میں شہید کیا گیا ہے۔ بعد میں جب ان کا قاتل شفیق گرفتار ہوا تو حقیقت کھلی۔

مولانا محمد مظہر الدین کا جرم اتنا تھا کہ وہ اپنے اخبار ''الامان'' میں عقیدت و محبت کے ساتھ مسلسل محمد علی جناح کے ساتھ قائداعظم لکھا کرتے تھے۔ مولانا صاحب کی یہ ادا اُس دور کے پاکستان مخالف گروہ کو سخت ناپسند تھی۔ اسی لیے ان کے قتل کا منصوبہ بنایا گیا۔ منصوبے کے مطابق ایک سرپھرا نوجوان صبح 10 بجے مولانا محمد مظہر الدین کے دفتر پہنچا۔ وہ بہ ظاہر عقیدت مند بن کر ان کی تعریف کے پل باندھنے لگا۔ مولانا صاحب اُس وقت اداریہ لکھنے میں مصروف تھے۔ اچانک اُس نوجوان نے ان کی مصروفیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا تیز چاقو اُن کے پیٹ میں گھونپ دیا اور فوراً دفتر سے نکل کر فرار ہوگیا۔ مولانا مظہر الدین کچھ دیر بعد ہی انتقال کر گئے۔ تھوڑی دیر بعد یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پوری دہلی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ قائداعظم محمد علی جناح کو مولانا مظہر الدین کے اس بھیانک قتل پر دلی صدمہ پہنچا۔ انہوں نے اس سیاسی قتل کی سخت الفاظ میں مذمت کی اور دہلی کی حکومت سے اپیل کی وہ اس قتل کی فوری تحقیقات کرے اور قاتل کو گرفتار کر کے اُسے کیفرکردار تک پہنچائے۔

قائداعظم نے انہیں شہید صحافی قرار دیا۔ اُن کی نماز جنازہ کے بعد مسجد فتح پوری کے پیش امام مولانا مفتی مظہر اللہ نقش بندی نے آپ کے شہید ہونے کا فتویٰ دیا۔ تاریخی حوالے ثابت کرتے ہیں کہ انہوں نے ہی پہلی بار محمد علی جناح کو قائداعظم کا لقب دیا تھا، جو بے حد مقبول ہوا۔

مولانا محمد مظہر الدین بجنور کے علاقے شیر کوٹ میں 1888ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد عملی زندگی کا آغاز کانپور مدرسہ میں درس و تدریس سے کیا۔ اسی دوران جمعیت الانصار کی سرگرمیوں میں جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیتے رہے۔ 1918ء میں بجنور سے نکلنے والے اخبار ''روزنامہ مدینہ'' سے صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ 1920ء میں اپنا ہفت روزہ اخبار ''الامان'' بجنور سے جاری کیا۔ انہوں نے اپنے اخبار کے ذریعے خلافت تحریک کی پُرزور حمایت کی اور بجنور کی خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے۔

تحریک خلافت دراصل پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکوں کی حمایت میں حکومت برطانیہ کے خلاف ہندوستان کے مسلمانوں کے جوش و جذبے کا نام ہے۔ پہلی جنگِ عظیم میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ بعد میں معاہدہ سیورے کے مطابق برطانیہ اور فرانس نے ترکی کے حصے کر دیئے۔ ہندوستان میں بدنام زمانہ رولٹ ایکٹ کے نفاذ سے پہلے ہی مسلمانوں میں شدید غم و غصہ پایا جاتا تھا۔ معاہدے سیورے نے اس معاملے پر جلتی پر تیل کا کام کیا۔

ہندوستان کے مسلمان بڑے بے چین ہوئے۔ وہ ترکی میں قائم خلافت عثمانیہ کو متحد دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی سبب یہ تحریک شروع ہوئی، جو تحریک خلافت کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس تحریک میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان، مولانا ابو الکلام آزاد، حکیم محمد اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا حسرت موہانی جیسے اہم رہ نما شامل تھے۔ تحریکِ خلافت نے تمام مسلمانوں کو نہ صرف متحد بلکہ پُر جوش بنا دیا تھا۔

اس زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس نے حکومتِ برطانیہ کے خلاف تحریک ترک موالات شروع کی۔ مسلمان، ہندو اور دُوسری قومیں کانگریس کے پرچم تلے متحد ہو گئیں۔ خلافت تحریک اور ترکِ موالات کی تحریک ہم آہنگ ہو گئیں۔ مسلمانوں نے قانون ساز کونسلوں اور سرکاری ملازمتوں کا بائیکاٹ شروع کر دیا۔ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ کے مقابلے میں جامعہ ملیہ دہلی کی بنیاد رکھی گئی۔ مسلمانوں نے بڑی تعداد میں خود کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ بہت سے مسلمان اپنی جائیدادیں فروخت کر کے افغانستان کی جانب ہجرت کر گئے۔

تحریکِ خلافت نے دراصل ہندوستان میں حکومت برطانیہ کی بنیادیں ہلا دیں، لیکن جب 1922ء میں مصطفیٰ کمال اتاترک نے ترکی میں خلافتِ عثمانیہ کو ختم کر دیا تو ہندوستان میں اس کی محبت اور ہمدردی میں اٹھنے والی تحریک خود بخود سرد پڑ گئی۔

مولانا محمد مظہر الدین نے ہفت روزہ اخبار ''الامان'' کو بعد میں دہلی منتقل کر دیا۔ یہی ہفت روزہ بعد میں سہ روزہ (ہر تیسرے دن شائع ہونے والا) اخبار بن گیا۔ مولانا نے مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد اس کا پیغام گھر گھر پہنچانے کے لیے ایک اور اخبار ''وحدت'' جاری کیا۔

انہوں نے 1937ء میں قائداعظم محمد علی جناح اور لیاقت علی خان کو دہلی میں استقبالیہ دیا جو دہلی میں اپنی نوعیت کا شان دار استقبالیہ تھا۔ انہوں نے اپنے ادارے کی جانب سے سپاس نامہ (تحریری شکریہ) بھی پیش کیا۔ جس میں محمد علی جناح کو قائداعظم اور ندائے ملک و ملت (ملک وملت کی آواز) کے خطابات بھی دیے گئے۔ اس کے بعد تو مولانا محمد مظہر الدین نے قائداعظم کے لقب کی گویا باقاعدہ تشہیر شروع کر دی۔

1938ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ پٹنہ میں میاں فیروز الدین نے قائداعظم کا نعرہ لگایا تو اس کے بعد قائداعظم کا یہ لقب عوامی ہو گیا۔ مولانا مظہر الدین نے 1938ء میں مسلم لیگ کی جانب سے مصر میں منعقدہ فلسطین کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ اس وفد میں ان کے ہمراہ عبدالرحمٰن صدیقی، چوہدری خلیق الزمان صدیقی اور مولانا حسرت موہانی تھے۔ مولانا محمد مظہر الدین نے ''الامان'' کا مصر نمبر بھی شان دار انداز میں شائع کیا تھا۔

مولانا محمد مظہر الدین اچھے انشاء پرداز (نثر لکھنے والے) ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے مقرر بھی تھے۔ آپ پُر جوش انداز میں تقریر کیا کرتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد آپ کی بیوہ اور بچے پاکستان آ گئے اور ''الامان'' کراچی سے جاری کیا جو کچھ عرصے بعد بند ہو گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم رجب کا مہینہ شروع ہونے سے پہلے یہ دُعا مانگا کرتے تھے کہ اے اللہ! ہمارے لیے رجب اور شعبان کے مہینہ میں برکت عطا فرمائیے اور ہمیں رمضان تک پہنچائیے۔

یوں ہمیں رمضان المبارک سے دو مہینے پہلے ہی رمضان کی تیاری کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

رمضان المبارک میں ایک فرض ادا کیا جائے تو ستر فرضوں کے برابر اجر ملتا ہے، اس ماہ میں اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتی ہیں۔ اس مبارک مہینہ میں ایک رات ہے، جس کا نام لیلۃ القدر ہے۔ لیل کے معنی ہیں رات اور قدر کے معنی عظمت کے ہیں۔ یعنی اس رات کو عظمت حاصل ہے۔ اِسی رات میں قرآن مجید کے نزول کی ابتداء ہوئی تھی۔

بنی اسرائیل میں ایک عبادت گزار تھا، وہ ساری رات عبادت میں مشغول رہتا، اور دن بھر جہاد کرتا، اُس نے ایک ہزار مہینہ مسلسل اسی طرح عبادت میں گزار دیئے۔

اُس زمانے میں لوگوں کی عمریں بہت لمبی ہوتی تھیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ قدر نازل فرمائی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو فضیلت بخشی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ شبِ قدر رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ طاق راتیں ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹ کہلاتی ہیں۔ اس ایک رات کی عبادت ایک ہزار مہینوں یعنی ۸۳ سال سے زیادہ کی عبادت سے بہتر ہے۔ اس رات میں جو شخص عبادت کرتا ہے تو اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔

اس رات حضرت جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کی جماعت کے ساتھ زمین پر اترتے ہیں اور اللہ کے جو بندے مرد یا عورت اللہ تعالیٰ کے ذکر، نماز میں مشغول ہوتے ہیں، سب کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔

اس رات عبادت کی جائے، قرآن مجید کی تلاوت کی جائے، اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے، کچھ وقت دُعا کی جائے اور ہاں! اسی مبارک رات میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ شمسی مہینہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ تھا جب کہ اسلامی مہینہ رمضان المبارک تھا، جس کی ۲۷ ویں شب تھی۔

اس مبارک رات کی رحمتیں اور برکتیں رمضان المبارک کی ۲۶ویں تاریخ کو مغرب کے وقت سے سورج کے طلوع ہونے تک پوری رات رہتی ہیں، اس رات ہمیں ان مسلمانوں کے لیے دُعائے مغفرت کرنی چاہیے، جو آزادی کے حصول میں ہم سے جدا ہوگئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے لا الہ الا اللہ کے نام پر یہ عظیم ملک ہمیں عطا فرمایا ہے۔ اس کے استحکام کے لیے دُعا کریں، اے اللہ! اسے نظرِ بد سے بچا اور ہر شر سے اس کی حفاظت فرما۔ جب تھک جائیں تو سو جائیں اور سحری میں جلد اٹھنے کی کوشش کریں، خصوصاً عشاء اور فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی جائے۔ جو شخص یہ دو نمازیں جماعت سے پڑھ لے گا اُس نے تمام رات کی عبادت کا ثواب پالیا۔

انصاف کا تقاضا

فرحت جاوید

خیبر پختونخواہ میں ایبٹ آباد نامی ایک بڑا خوب صورت شہر ہے۔ درختوں سے ڈھکا ہوا یہ سرسبز شہر ایک صحت افزاء مقام بھی ہے۔ گرمیوں میں اس شہر کی رونق اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ موسم گرما میں دُور دُور سے لوگ یہاں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں فوجی چھاؤنی بھی ہے۔ اس شہر سے کوئی 12 کلومیٹر دُور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو شہروان کہلاتا ہے۔ یہ قصبہ اگرچہ چھوٹا سا ہے مگر ہے بڑا خوب صورت۔ یہاں انگریزوں کے وقت کا ایک تھانہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ ایک کالج اور ایک پہاڑی پر ریسٹ ہاؤس بھی ہے۔ شہروان روڈ کے درمیان میں کوٹھیالہ نامی ایک بڑا علاقہ ہے۔ پاک و ہند کی تقسیم سے پہلے برصغیر پر تقریباً دو سو سال تک انگریز حکومت کرتے رہے ہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں کوٹھیالہ کا علاقہ ایک بہت بڑے رئیس محمد خان کی جاگیر میں شامل تھا۔ کوٹھیالہ ایک خوب صورت وادی ہے، جس میں دوطرح کے لوگ رہتے تھے۔ رئیس خاندان بھی اور محنت کش طبقہ بھی، وہ کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے۔ یہ بڑی پُرامن وادی تھی۔ اس وادی کے ساتھ ایک جنگل بھی تھا۔ جنگل کی اہمیت سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ اس جنگل میں زیادہ تر چیڑھ کے درخت تھے۔ جن کو حکومت کی اجازت کے بغیر کاٹنا منع تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہے۔ یہ درخت ہی ہیں جن کی وجہ سے بارش برستی ہے۔ اس کے علاوہ انھی کی لکڑی سے بڑی بڑی عمارتیں بنائی جاتی ہیں اور انھی سے فرنیچر بنتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ درخت ہی ہیں جو آکسیجن خارج کرتے ہیں، جو سانس لینے کے لیے بے حد ضروری ہے۔ یہ انگریزوں کے دور کی بات ہے کہ کسی نے علاقہ مجسٹریٹ کے دفتر (ایبٹ آباد) رپورٹ کی کہ کوٹھیالہ کے جنگل سے کسی نا معلوم افراد نے کئی درخت کاٹ لیے ہیں۔ اُس وقت صاحب زادہ کالا خان نامی ایک صاحب ایبٹ آباد میں علاقہ مجسٹریٹ تھے۔ اگرچہ ان کا نام کالا خان تھا، مگر تھے وہ بڑے سرخ وسفید رنگت والے، وہ دیانت دار افسر تھے۔ جیسے ہی انہیں درخت کٹنے کی خبر ملی انہوں نے فوراً ہی کوٹھیالہ میں کچہری لگانے کا حکم دے دیا۔ انگریزوں کے زمانے میں سرکاری آفیسر جگہ جگہ کچہریاں لگایا کرتے تھے اور ہر مقدمے کا فیصلہ کچہری کے دوران کر دیا کرتے تھے۔ اسی طرح صاحب زادہ کالا خان نے بھی کوٹھیالہ میں کچہری لگانے کا حکم دیا۔ ایک ایلچی نے کوٹھیالہ کے رئیس محمد خان کو جا کر اطلاع دی۔ کوٹھیالہ کے رئیس محمد خان نے علاقہ کے تمام لوگوں کو مقررہ تاریخ پر کچہری میں حاضر ہونے کی تاکید کی۔ مقررہ تاریخ سے ایک دن پہلے سرکاری عملہ کوٹھیالہ پہنچ گیا۔ کوٹھیالہ کی عید گاہ میں جو کہ ایک بہت بڑا میدان تھا۔ اُس میں خیمے لگا دیئے

گئے۔ اور دیگر سامان بھی مہیا کیا گیا۔ اگلی صبح لوگ جوق در جوق میدان میں جمع ہونے لگے۔ لوگوں میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں کہ نہ جانے کس وجہ سے کچہری لگ رہی ہے اور نہ جانے علاقہ مجسٹریٹ کیا حکم صادر کرنے والے ہیں۔ عملے کے لیے کھانا پک رہا تھا۔ عملہ اپنے کام میں مصروف تھا، مگر لوگ بہت زیادہ ڈرے اور سہمے ہوئے تھے۔ اتنے میں سرکاری جیپ آکر رکی جس میں سے علاقہ مجسٹریٹ ایک انگریز افسر کے ساتھ کوٹ ٹائی پہنے ہوئے نکلے۔ ان کے ساتھ باوردی سپاہی بھی تھے۔ سلامی لینے کے بعد انہوں نے جرگہ کے لوگوں سے خطاب کیا کہ مجھے فلاں دن اطلاع ملی تھی کہ کوٹھیالہ کے جنگل سے نامعلوم افراد نے کئی درخت کاٹ ڈالے ہیں اور آپ لوگ جانتے ہیں کہ درخت کاٹنا کتنا بڑا جرم ہے۔ ان درختوں سے ہمیں بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ انہی سے ہمیں ٹھنڈی ہوا میسر آتی ہے، انہیں سے بخارات بن کر بادل بنتے ہیں اور بارش برستی ہے، ان سے ہمیں بیسیوں فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اگر اسی طرح درخت چوری چھپے کٹنے لگے تو جنگل اجڑ جائے گا، اسی لیے میں نے آج کچہری لگانے کا حکم دیا تھا۔ میں تو ذاتی طور پر بھی درخت کاٹنے کے انتہائی خلاف ہوں۔ وہ انتہائی غصے میں جرگہ والوں سے کہہ رہے تھے کہ میں اس سلسلے میں کسی کی بات نہیں سنوں گا یا تو تاوان دیا جائے یا مجرم پکڑے جائیں۔

پیارے بچو! سب لوگ دم بخود علاقہ مجسٹریٹ کی تقریر سن رہے تھے۔ کسی میں دم مارنے کی جرأت نہیں تھی۔ چونکہ اس علاقے کے رئیس محمد خان تھے اس لیے علاقہ مجسٹریٹ نے حکم صادر کر دیا کہ میں رئیس محمد خان کو ایک ہزار روپیہ جرمانہ کرتا ہوں کیوں کہ یہ اس علاقے کے رئیس ہیں اور مجرم کو پکڑنا ان کی ذمہ داری ہے۔ اس وقت ہزار روپیہ بہت بڑی رقم ہوتی تھی اور اتنی بڑی رقم ہر ایک کے پاس نہیں ہوا کرتی تھی۔ جرگہ ہزار روپیہ جرمانے کا سن کر دھک سے رہ گیا، لیکن اتنے میں علاقہ مجسٹریٹ مسکرائے اور اپنی جیب سے ہزار روپیہ نکال کر جرمانہ سرکاری بنک میں جمع کرا دیا۔ مجسٹریٹ صاحب زادہ کالا خان سے رئیس محمد خان کا کیا رشتہ تھا؟ صاحب زادہ کالا خان، رئیس محمد خان کے بیٹے تھے، لیکن ایک بیٹا ہونے کے باوجود صاحب زادہ کالا خان نے انصاف کے تقاضے کو پورا کیا۔ اسی وجہ سے آج بھی خیبر پختونخواہ کے لوگ ان کے انصاف کی بدولت ان کا نام بڑی عزت و احترام سے لیتے ہیں۔

پیارے بچو آپ بھی پڑھ لکھ کر انصاف کے تقاضے پورے کر کے ملک وقوم کی خدمت کریں اور نیک نامی حاصل کریں۔

☆☆☆

''بلاعنوان'' کے یہ عنوانات بھی اچھے تھے

☆ آسمان سے گرا مچھلیوں میں اٹکا۔ حسن علی خان، ڈیرہ اسماعیل خان

☆ موٹے نے کمال کیا، مچھلیوں کو اُچھال دیا۔ خلیل حسان، اٹک

☆ موٹو میاں پانی میں، مچھلیاں ہیں پریشانی میں۔ عمار ازہر، بہاول پور

☆ موٹو آیا، زلزلہ لایا۔ سندس عمر، کراچی

☆ اس تالاب میں یا تو تم رہو گے یا ہم۔ اویس شوکت، فیصل آباد

☆ مچھلیوں کے رنگ، دیکھو میرے سنگ۔ ثمن اظہر، لاہور

☆ آج مچھلیوں کی خیر نہیں۔ طیب طاہر، لاہور

☆ لو میں آ گیا مچھلیوں کے دیس میں۔ قمر ناز دہلوی، کراچی

☆ ارے شیطان، ہمیں کیوں کیا پریشان۔ عفان عثمان، شیخوپورہ

☆ ننھے نے چھلانگ لگائی، مچھلیوں کی شامت آئی۔ حافظ عمیر فہیم، حویلی لکھا

☆ باہر گرمی، اندر مچھلی، میں کہاں جاؤں۔ حمنہ عارف، لاہور کینٹ۔

☆ یہ سوئمنگ پول ہے یا مچھلی پول۔ طوبیٰ یوسف، لاہور

☆ واہ! کیا چھلانگ ہے۔ دانیال احمد، کراچی

☆ آخر ہم نے تیرنا سیکھ لیا۔ حباز ہرا، لاہور

☆ یہ ہے نہانے کا صحیح طریقہ ابتہال سلیم، حیدرآباد

☆ ارے منے! ذرا سنبھل کر۔ محمد حسن رضا، جوہر آباد

☆ مچھلیاں بولیں ''بھاگو موٹا آیا'' صدف نیاز، راول پنڈی

☆ مچھلیاں پکڑنے کا نیا طریقہ ثاقب ضیاء، کوئٹہ

☆ بچ جاؤ اے مچھلیو! لو میں آ گیا عبدالرحمٰن، لاہور

☆ بھولا مچھلیوں کے جال میں۔ حسن رضا، فیصل آباد

سروش نے اپنی مٹھیاں اپنی بہن مائرہ کو دکھاتے ہوئے کہا: ''میرے دائیں اور بائیں ہاتھ میں کچھ روپے ہیں، میں اگر دائیں ہاتھ سے ایک روپیہ لے کر بائیں ہاتھ میں رکھتا ہوں تو دونوں ہاتھوں میں روپے برابر ہو جاتے ہیں اور اگر میں بائیں ہاتھ سے ایک روپیہ لے کر دائیں ہاتھ میں رکھتا ہوں تو دائیں ہاتھ کے روپے بائیں ہاتھ سے دُگنے ہو جائیں گے۔ تم بتاؤ میرے دائیں اور بائیں ہاتھ میں کتنے روپے ہیں؟'' مائرہ نے کچھ سوچ کر جواب دیا تو سروش نے خوش ہو کر کہا: ''واہ، تم تو بہت ذہین ہو، درست جواب دینے پر میں تمھیں انعام دوں گا۔'' آپ نے کھوج لگانا ہے کہ سروش کے دائیں اور بائیں ہاتھ میں کتنے کتنے روپے تھے؟

جولائی 2012ء میں شائع ہونے والے ''کھوج لگائیے'' کا صحیح حل: علیم اپنے دوست کو ملنے اسلام آباد گیا تھا۔ درج ذیل بچے بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار قرار پائے ہیں۔
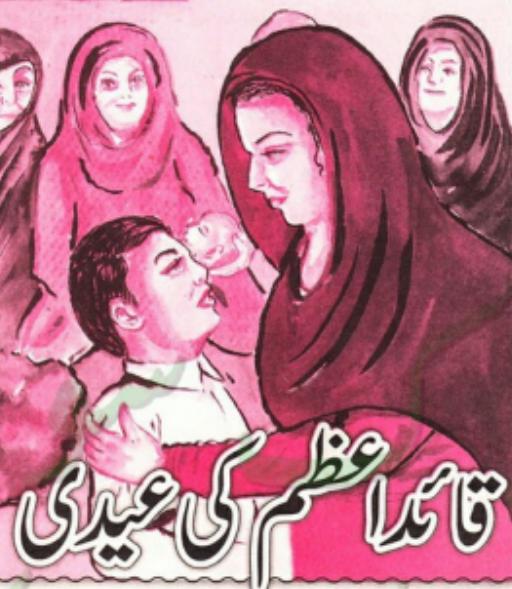
1۔ عائشہ بتول، مظفر گڑھ
2۔ محمد ریان طیب، راول پنڈی
3۔ فرح مسعود، لاہور
4۔ سید غالب شاہ، پشاور
5۔ بریرہ احمد، ملتان

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 اگست 2012ء ہے۔

کھوج لگائیے!

نام: ____________

پتا: ____________

____

قائداعظم کی عیدی

بچوں کو قائداعظم سے عیدی ملی تھی مگر کیسے؟

پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی

چھک---- چھک---- چھکا چھک--- چھکا چھک--- چھکا چھک--- چھک چھک چھک چھک ک ک ک----'' ریل گاڑی رفتار پکڑ چکی تھی۔ یہ انبالہ سے آنے والی ساتویں ریل گاڑی تھی جو لٹے پٹے مہاجرین کو لے کر لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر آرہی تھی، اس گاڑی کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں سوار مسافروں میں خواتین اور بچوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مُسلم گھرانوں کے مردوں کو سکھوں اور ہندوؤں نے بڑی بے دردی سے شہید کردیا تھا اور اب اُن مسلمانوں کے لٹے پٹے گھرانے اپنی عزت و آبروٗ بچانے اس پاک سرزمین کی جانب آرہے تھے جس کے حصول کے لیے قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے کمزور و ناتواں وجود کے باوجود دن رات محنت کی تھی اور انگریزوں اور ہندوؤں کے پنجوں سے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد سرزمین حاصل کرلی تھی۔

''چھکا چھک---- چھکا چھک---- چھکا چھک---- چھکا چھک------'' نذیراں بھاپ سے چلنے والے انجن کا شور سن کر اپنے خیالات سے چونکی اور اپنی گود میں سوئے ہوئے سات سالہ معصوم رفیق حسن کو دیکھا جس کے معصوم چہرے پر ایک آزاد وطن کو دیکھنے اور وہاں رہنے بسنے کی روشنی چمک رہی تھی۔ اچانک نذیراں کو اپنا شوہر یاد آیا جسے ایک سِکھ نے برچھی مار کر شہید کردیا تھا اور وہ کلمہ پڑھتے ہوئے جامِ شہادت نوش کرگیا تھا---- گرتے گرتے اُس نے اُکھڑتی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اپنی بیوی نذیراں سے کہا تھا کہ اب تُو ہی رفیق پُتر کو باپ اور ماں دونوں کا پیار دے گی۔ اتنا کہہ کر وہ اپنے رب کے حضور پیش ہوگیا۔ ایک یتیم بچے کا ساتھ اور دُنیا کے مسائل----ایک غریب بیوہ عورت، مگر نذیراں نے ہمت نہ ہاری اور لٹے پٹے قافلوں کے ہمراہ در در کی خاک چھانتی ہوئی اب اس ریل گاڑی میں بیٹھی تھی۔

اٹاری قریب آئی تو اچانک ماں کی گود میں سر رکھے سویا ہوا رفیق ایک دم سے بیدار ہوگیا اور بیٹھتے ہوئے پوچھا:

''اماں! کیا پاکستان آگیا ہمارا؟''

نذیراں بڑے دُکھی انداز سے مُسکرائی جیسے مُسکرانے سے اُس کے چہرے پر سخت تکلیف ہورہی ہو۔ وہ بولی: ''کیوں پُتر--- تجھے کیا پاکستان کی خوش بو آگئی ہے سوتے سوتے میں-----''

معصوم رفیق ماں کی بات نہ سمجھا اور بولا: ''نہیں نہیں اماں میں نے خواب میں ابا اور وہ لمبی سی ٹوپی والے بابا---جن کی تصویر والا اخبار چاچا کرمو لایا تھا نا ہمارے گھر---کیا نام ہے اُن کا؟'' رفیق سوچتے ہوئے بولا۔

اسے یاد نہ آیا تو نذیراں نے یاد دلایا۔

''قائداعظم محمد علی جناح!!!''

جھوٹ نہیں بولتا۔ اس نے ضرور یہی خواب دیکھا ہوگا۔

لاہور کے ریلوے اسٹیشن کا منظر دیکھ کر ہر مسافر خوف سے لرز اُٹھا۔ دُور دُور تک لاشیں ہی لاشیں تھیں۔۔۔ مسلمانوں کی لاشیں۔۔۔۔۔ اُن مسلمانوں کی لاشیں جنھوں نے اپنی پاک سرزمین پر قدم رکھ کر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا اور ایک غلام ملک میں غلامی کی موت مرنا پسند نہیں کیا تھا۔

دو دن نذیراں اور رفیق مہاجر کیمپ میں رہے۔ تین دن بعد عیدالفطر یعنی میٹھی عید تھی۔ پاکستانیوں کی پہلی عید۔

عید کے دن ایک افسر کیمپ میں آیا اور مہاجرین کو مخاطب کر کے بولا: ''جس کے ساتھ جتنے بچے ہیں وہ ان بچوں کا نام، ولدیت (والد کا نام) اور اپنا نام لکھوادے، قائداعظم نے پاکستانی بچوں کو عیدی بھجوائی ہے!''

اتنا سنتے ہی سب بے پناہ خوش ہوئے۔ رفیق چیخا:

'' دیکھا اماں میں نے بتایا تھا نا کہ قائداعظم نے ابا کو اسی لیے پیسے نہیں دیے تھے!''

افسر کے کان کھڑے ہوئے۔ ''کون سے پیسے؟''

'' بچہ ہے جی۔۔۔ کیسی بات کرتے ہیں آپ بھی۔۔۔ اتنی لاشوں کو دیکھ کر گھبرا گیا ہے جی!'' ایک بوڑھے نے بات بنائی اور گھور کر رفیق کو دیکھا۔ نذیراں نے الگ چٹکی

وہ چونکا ''ہاں ہاں اماں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہی قائداعظم، میں ابا اور قائداعظم کو خواب میں دیکھ رہا تھا کہ ابا قائداعظم سے پیسے مانگ رہے ہیں کہ میں اپنے رفیق کو دوں گا ۔۔۔ وہ پاکستان جارہا ہے!'' رفیق نے پھولتی سانسوں کے درمیان اپنی بات پوری کی۔

'' تو کیا قائداعظم نے پیسے دیے تیرے ابے کو؟'' نذیراں نے پوچھا۔ اب ڈبے میں موجود دیگر عورتیں اور بچے بھی اس دل چسپ گفتگو کو سُننے پر مجبور ہوگئے۔
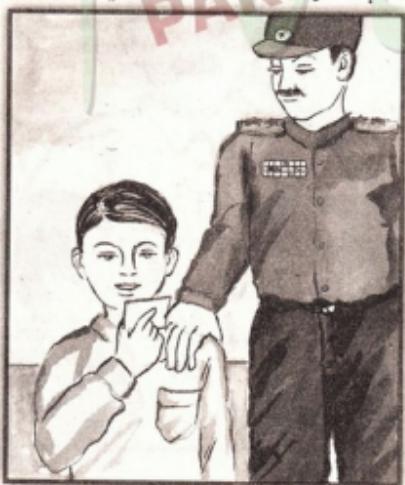
''نہیں، نہیں اماں، قائداعظم ابا پر بہت خفا ہوئے کہ رفیق کو بھیک کیوں دلواتا ہے محمد توفیق، میں نے پاکستان بھکاریوں کے لیے حاصل نہیں کیا۔ یہاں کا بچہ بچہ محنت کرے گا، علم حاصل کرے گا اور پڑھ لکھ کر پوری دُنیا میں پاکستان کا نام روشن کرے گا، اور محمد توفیق میں تجھے پیسے کیسے دے سکتا ہوں ۔۔۔۔۔ میرے پاس جو تھوڑے سے پیسے بچے ہیں وہ میں پاکستانی بچوں کو اُن کی پہلی عید پر عیدی کے طور پر دوں گا۔۔۔'' اتنا کہہ کر رفیق خاموش ہوگیا اور ڈبے میں موجود عورتیں اور بچے رفیق کے خواب پر ہنسنے لگے۔

نذیراں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ جانتی تھی کہ رفیق کبھی

کاٹی۔ رفیق بلبلا کر خاموش ہوگیا۔

گھنٹہ بعد ایک بڑے سے پتیلے میں دودھ سویّاں اور کچوریاں کیمپ میں لائی گئیں اور یوں پاکستانیوں نے اپنے رب کے حضور عید کی نماز پڑھ کر اپنی پہلی عید منائی۔ اس دوران کاغذی کارروائی بھی پوری ہوچکی تھی اور فی بچہ ایک روپیہ عیدی بھی بانٹی جارہی تھی۔ رفیق کو عیدی ملی تو اُس نے کہا:

''میں تو ان پیسوں سے خوب پڑھوں گا!'' اچانک کسی نے ایک بھاری بھرکم ہاتھ اُس کے نازک سے وجود پر رکھ دیا اور ایک بھاری سی آواز سُنائی دی۔

''بیٹا! پاکستان کے تمام بچے خوب پڑھیں گے اور اس ملک کو ترقی دیں گے، ایمان داری سے کام کریں گے اور خوب محنت کریں گے۔۔۔۔ اپنا ہوم ورک پورا کریں گے اور ہر سبق کو دل لگا کر یاد کریں گے، ورنہ قائد اعظم کی عیدی پھر کسی کو نہ مل سکے گی!''

اتنا کہہ کر ابا خاموش ہوئے اور اپنے دونوں ہونہار پوتوں محمد حسن نوید اور سعد سُفیان کو دیکھا۔ دونوں دم بخود ابا کی انوکھی کہانی سن رہے تھے، اُن کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ اُن کے ابا کی اپنی سچّی کہانی ہے۔ ابا کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے ۔حسن اور سعد افسردہ ہوگئے اور حسن میاں نے ماحول کی سنجیدگی سے گھبرا کر کہا:

''ابا۔۔۔ابا۔۔۔قائد اعظم کیا اب دُوسرے پاکستانی بچوں سے ناراض ہوگئے ہیں؟ یہ تو رمضان کا مہینہ ہے نا ابا اور عید بھی تھری فور (تین چار) دن کے بعد آجائے گی۔۔۔تو ۔۔۔۔تو ۔۔۔اب قائد اعظم پاکستانی بچوں کو عیدی کیوں نہیں دیتے؟''

ابا زور سے ہنسے'' ٹھاٹھاٹھاہ ہ ہ ہاہاہاہاہا۔۔۔۔۔۔ارے بھئی قائد اعظم تو اب اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے لیکن میاں ۔۔۔اب بھی وہ پاکستانی بچوں کو عیدی دیتے ہیں۔۔۔۔۔''

'' لیکن کہاں دیتے ہیں؟ مجھے تو آج تک نہیں دی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور سعد کو بھی نہیں دی۔۔۔ ہے نا سعد۔''

''ہاں۔۔۔۔ بھائی۔۔۔ قائد۔۔۔ اعظم۔۔۔ عیدی نئیں۔''
(یعنی ہاں بھائی قائدِ اعظم نے عیدی نہیں دی)

ابا ہنس کر بولے: ''اور جو مجھ سے عیدی لیتے ہو، بابا سے، ماما سے، امّاں سے اور سب لوگوں سے، اُس عیدی پر کس کی تصویر بنی ہوتی ہے؟'' ابا مُسکرائے۔ وہ بھی حسن ہی کے ابا تھے۔ اچانک حسن اور سعد میاں نے خوشی سے اُچھلنا شروع کر دیا:

''جی ہاں ۔۔۔۔۔۔۔ جی ہاں۔۔۔۔۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ قائد اعظم تو ہم بچوں کو بھی عیدی دیتے ہیں کیوں کہ وہ تو پاکستان کے بانی ہیں نا اور اچھے بچّوں سے بہت پیار بھی کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔'' خوشی حسن میاں کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔ وہ قائد اعظم سے بڑی محبت کرتے تھے اور ابا سے قائد اعظم کے کئی سچّے واقعات بھی سن چکے تھے۔

ابا مُسکرائے اور بولے: ''بس تو اپنی عیدی کو اونگے بونگے کاموں میں خرچ نہ کرنا ورنہ قائد اعظم ناراض ہوجائیں گے۔۔۔اور پھر کبھی عیدی نہیں دیں گے۔۔۔۔۔!!!!''

چچا تیزگام نے بچوں کو عیدی دی

محمد فہیم عالم

عید کا چاند نظر آ گیا تھا، جیسے ہی عید کا چاند آیا، ہر طرف خوشی اور شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ سورج ڈھلتے ہی یہ توقع کی جا رہی تھی کہ عید کا چاند نظر آ جائے گا اور کل عید ہو گی، آخر لوگوں کی دُعائیں اور اُمیدیں بر آئی تھیں۔ چاند نظر آتے ہی چچا تیزگام نے جمن اور استاد کو بازار کی طرف دوڑایا۔

''استاد! بھاگ کر جاؤ اور شبراتی حلوائی سے دس کلو دودھ لے کر آؤ، ارے...... یہ کیا...... تم ابھی تک یہیں ہو، کہیں دودھ ختم نہ ہو جائے اور جمن تم یوں کھڑے کھڑے میرا منہ کیوں تک رہے ہو۔ جاؤ سویاں اور میوہ لے کر آؤ۔''

چچا تیزگام کے کہنے پر دونوں بازار کی طرف سر پر پاؤں رکھ کر دوڑے۔

''یہ جمن اور استاد کہاں غائب ہو گئے ہیں، میں کب سے انہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔'' چچا تیزگام دونوں کو بازار بھیج کر واپس مڑے ہی تھے کہ بیگم کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

''وہ...... ہم نے ان کو بازار بھیجا ہے، دودھ اور سویاں لانے کے لیے۔''

''لیکن دودھ اور سویاں تو میں پہلے ہی منگوا چکی ہوں۔''

''کب......!!!'' چچا تیزگام چلاّ اٹھے۔

''کم بختوں نے تو ہمیں بتایا ہی نہیں، ہم ابھی ان نامعقولوں کی خبر لیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر چچا تیزگام دروازے کی طرف بڑھے۔

''ارے......

ارے...... رُک جائیے، ان کو لانے دیں دودھ اور سویاں، میں نے جو دودھ اور سویاں منگوا رکھی ہیں۔ وہ ہو سکتی ہیں کم پڑ جائیں، کیوں کہ عید کے موقع پر بہت سے مہمان جو آتے ہیں۔'' بیگم بولیں۔

مہمانوں کا سن کر چچا تیزگام گھر سے باہر جاتے جاتے رک گئے۔

''مہمان، کون سے مہمان......؟ کہاں سے آ رہے ہیں، کب آ رہے ہیں اور سب سے بڑا سوال تو یہ ہے کہ کیوں آ رہے ہیں؟'' چچا تیزگام نے تیز تیز بولتے ہوئے کہا۔

''وہ جو میری خالہ ہیں نا! خالہ ثمینہ۔ وہ آ رہی ہیں۔ وہ کیا آ رہی ہیں۔ میں نے بلایا ہے انہیں، ان سے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے تھے۔ وہ کل صبح اپنے گھر سے چلیں گی اور عید کی نماز تک ہمارے گھر پہنچ جائیں گی۔'' بیگم تفصیلات بتاتے ہوئے بولیں۔

''کیا ان کے بچے بھی ساتھ آ رہے ہیں؟''

''میاں! آپ بھی کمال کرتے ہیں، بھلا بچوں کو وہ کہاں چھوڑ

کر آئیں گی۔"

"اس کا مطلب ہے سات شرارتی بچے پھر ہمارے گھر آ رہے ہیں۔" چچا تیز گام کو خالہ ثمینہ کے 7 عدد بچوں کا خیال ہی مارے جا رہا تھا۔ خالہ ثمینہ بیگم کی دُور پرے کی خالہ تھیں۔ ان کے چھوٹے بڑے 7 بچے تھے۔ بچے کیا تھے بس آفت کے پر کالے تھے۔ اس لیے چچا تیز گام کا کہنا تھا کہ ایسی دُور پرے کی خالہ کو دُور ہی رکھنا چاہیے، لیکن بیگم کو اپنی اس خالہ سے بہت محبت تھی۔ گذشتہ سال بھی عید پر بیگم نے خالہ کو آنے کی دعوت دی تھی۔ عید کے دن صبح صبح ہی خالہ ثمینہ اپنے 7 عدد بچوں کے ساتھ آن وارد ہوئی تھیں۔ ان کے بچوں نے آتے ہی سارا گھر سر پر اٹھا لیا تھا۔ خصوصاً چچا تیز گام کی تو ناک میں دم کر کے رکھ دیا تھا۔ محاورتاً نہیں حقیقتاً۔ چچا تیز گام اپنے کمرے میں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے کہ اچانک بڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ان کو اپنی ناک میں کوئی چیز داخل ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"ہاہا...... ہاہا......" انہوں نے چونک کر دیکھا تو خالہ کا منجھلا بیٹا بنٹو ہاتھ میں ایک لمبا سا تنکا لیے دانت نکال رہا تھا۔ وہ اُسے مارنے کے لیے لپکے تو وہ پل بھر میں کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میز سے ان کی عینک غائب تھی۔ وہ عینک کی تلاش میں نکلے تو صحن میں منٹو اُن کی عینک ناک پر رکھے ڈاکٹر بنا محمود کا چیک اپ کر رہا تھا۔ چچا تیز گام نے جو اُسے غصے سے عینک دینے کو کہا تو اُس نے "چچا کیچ کیجیے۔" کہہ کر عینک اُن کی طرف اُچھال دی۔ جو کہ ان کے ہاتھوں میں آنے سے پہلے فرش پر گر کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ آفت کے پر کالے خالہ کے بچوں کو چچا تیز گام سے خدا واسطے کا بیر تھا۔

"خدا کا خوف کرو میاں! تم اتنے خوب صورت اور شریف بچوں کو شیطان کہہ رہے ہو۔ ایک ہی تو خالہ ہیں میری...... وہ بھی کبھی کبھی آتی ہیں۔" بیگم بُرا مان گئیں۔

"امی جان تو کیا اس عید پر بھی خالہ آ رہی ہیں۔" کمرے میں کھیلتے ہوئے عروج فاطمہ اور محمود بھی ان کے پاس آ گئے تھے۔

"وہ تو میری خالہ ہیں، تمہاری تو وہ نانی ہیں نانی۔" بیگم نے عروج فاطمہ اور محمود کو سمجھایا۔

"واہ...... پھر تو مزہ ہی آ جائے گا۔ بنٹو اور منٹو کے ساتھ ہم خوب مل کر کھیلیں گے۔"

"اس مرتبہ ہم ابا جان سے زیادہ عیدی لیں گے۔ اور مزے

مزے کی چیزیں کھائیں گے۔'' عروج فاطمہ بولی۔

''ہاں...... ہاں...... بھئی کیوں نہیں۔ اس مرتبہ ہم تم دونوں کو پہلے سے ڈبل عیدی دیں گے۔'' چچا تیز گام انہیں پیار سے چمکارتے ہوئے بولے۔ پھر انہوں نے اپنی نوٹوں سے بھری شیروانی کی جیب پر بھی ہاتھ پھیرا تھا۔ آج ہی گاؤں سے ان کی زمینوں کے ٹھیکے کے پیسے آئے تھے۔

''صرف ہم دونوں کو ہی نہیں بلکہ سب کو عیدی دیں گے، بنو، منو اور اُس کے بہن بھائیوں کو بھی......'' محمود بولا۔

''بیٹا! سب کو عیدی دینا تو مشکل ہو جائے گا۔ اتنے روپے بھلا ہم کہاں سے لائیں گے۔''

''اگر آپ ان کو عیدی نہیں دیں گے تو پھر ہم بھی عیدی نہیں لیں گے۔'' محمود نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

''ارے...... ارے...... تم تو ناراض ہی ہو گئے۔ چلو بھئی ٹھیک ہے۔ ہم سب بچوں کو عیدی دیں گے۔'' چچا تیز گام نے محمود کو منانے کے لیے یہ کہہ تو دیا تھا، لیکن وہ اب سوچ رہے تھے کہ وہ ایسا کس طرح کریں گے۔ خالہ کے سات بچے ان کو ویسے بھی ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ اچانک اُن کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور وہ بُری طرح اُچھلے۔

''آ گئی...... آ گئی...... واہ بھئی واہ، بہت خوب۔''

''کک...... کیا چیز آ گئی مالک!'' ان کے قریب سے گزرتے ہوئے استاد نے عجیب سی نظروں سے اُن کی طرف دیکھا۔

وہ اور جمن ابھی کچھ دیر پہلے ہی بازار سے واپس آئے تھے۔

''ایک بہت ہی زبردست اور شان دار ترکیب...... واہ بھئی واہ۔'' چچا تیز گام بولے اور پھر اچانک اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئے تو کافی مطمئن اور خوش نظر آ رہے تھے۔

چچا تیز گام عید کی نماز پڑھ کر گھر آئے تو خالہ اپنے 7 بچوں کے ساتھ نازل ہو چکی تھیں۔ چچا تیز گام جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے بچوں نے ان کو گھیر لیا اور لگے شور مچانے۔

''چچا...... چچا...... پیارے چچا ہمیں عیدی دیں۔''

''ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں، عید کا دن ہے۔ عیدی تو میں تمہیں ضرور دوں گا۔'' چچا تیز گام مسکرا کر بولے۔ اور دل کھول کر اُن سب کو عیدی دی۔ گھر میں تو اُن بچوں نے اودھم مچایا ہوا تھا۔ اس لیے چچا تیز گام اپنے دوستوں پہلوان جی اور گلو میاں کے گھر چلے گئے۔ دوپہر کو جب وہ واپس گھر آئے تو بیگم تیر کی طرح ان کی طرف لپکیں۔

''ارے میاں! یہ آپ نے کیا غضب کر دیا۔ کہاں تو آپ بچوں کو ایک روپیہ بھی عیدی دینے کو تیار نہ تھے۔ اور اب آپ نے بچے کو ہزار ہزار روپے پکڑا دیئے۔''

''ہاہا...... بیگم...... ہزار ہزار روپے...... ہاہا...... بیگم وہ تو ہم نے نقلی نوٹ دیئے ہیں۔'' چچا تیز گام زور زور سے ہنستے ہوئے بولے۔

''اور اصلی نوٹ کہاں ہیں؟''

''وہ یہ رہے۔'' چچا تیز گام نے اپنی شیروانی کی جیب میں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر بیگم کے سامنے کر دی۔

''اچھا تو یہ ہیں اصلی نوٹ۔'' بیگم نے کھا جانے والی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''اور نہیں تو کیا، ارے یہ کیا......'' جیسے ہی اُن کی نظر نوٹوں پر پڑی وہ دھک سے رہ گئے۔ نوٹوں پر جلی حروف میں ''عید مبارک'' لکھا تھا۔

''تت...... تو...... کیا ہم نے اصلی نوٹ۔'' چچا تیز گام کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ ان کی شیروانی کی دائیں بائیں دو جیبیں تھیں۔ انہوں نے دائیں طرف اصلی جب کہ بائیں طرف نقلی نوٹ رکھے تھے۔ تیزی میں عیدی دیتے ہوئے انہوں نے دیکھے بغیر اصلی نوٹ بچوں کو بطور عیدی دے دیئے تھے۔ اس صدمے کی وجہ سے چچا تیز گام زمین پر گرے اور بے ہوش ہو گئے۔ آنکھیں بند ہونے سے پہلے بس وہ اتنا ہی دیکھ سکے تھے کہ بچوں کے ہاتھوں میں نوٹ ہی نوٹ تھے اور وہ صحن میں شرارتیں کرتے ہوئے پھر رہے تھے۔

☆☆☆

میری زندگی کے مقاصد

فہد علی، کراچی
میں بڑا ہو کر دُنیا کو امن کا گہوارہ بناؤں گا۔

علی حسن، لیاقت پور
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

ملک محمد سفیر، فتح جھنگ
میں ان شاء اللہ پولیس آفیسر بن کر جرائم کا خاتمہ کروں گا۔

حسن مصطفیٰ، سرگودھا
میں انجینئر بن کر اپنے ماں باپ اور پیارے وطن کا نام روشن کروں گا۔

محمد عبداللہ، کراچی
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

عائزہ حسنین، لاہور
میں آرٹسٹ بن کر خوب صورت تصویریں بناؤں گی۔

طلحہ شاہد، ٹوبہ ٹیک سنگھ
میں کرکٹر بن کر پاکستان کا نام روشن کروں گا۔

نعیم امین، لاہور
میں رائٹر بن کر اپنے قلم سے اصلاحی کہانیاں لکھوں گا۔

اسوہ خان، کھاریاں
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

حمزہ رسول، ساہی وال
میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ملک وقوم کی خدمت کروں گا۔

عظمیٰ شہزادی، گجرات
ڈاکٹر بن کر دُکھی انسانیت کی خدمت کرنا میری زندگی کا مقصد ہے۔

معاذ احمد، لاہور
میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے والدین کا نام روشن کروں گا۔

حمید ظفر، تاندلیانوالہ
میں پڑھ لکھ کر علم کی روشنی ہر سُو پھیلاؤں گا۔

محمد ثاقب، اوتھل
میں وکیل بن کر حق و انصاف کا بول بالا کروں گا۔

محمد تاثیر مہدی، میاں والی
میں پائلٹ بن کر پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

سیف الاسلام، اوتھل
میری زندگی کا مقصد ڈاکٹر بن کر دُکھی انسانیت کی خدمت کرنا ہے۔

مائدہ رسول، ساہی وال
میں بڑی ہو کر ٹیچر بن کر بچوں کی تعلیم و تربیت کروں گی۔

مجتبیٰ رسول، ساہی وال
میں بڑا ہو کر سائنس دان بن کر اپنے ملک کی ترقی میں اہم کردار ادا کروں گا۔

ماجد عبدالرحمٰن، ڈیرہ غازی خان
میں پاک آرمی میں جا کر ارضِ پاک کی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

ذیشان رفیق، راول پنڈی
میں بڑا ہو کر سیاست دان بن کر ملک کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کروں گا۔

شہوار، گوجرانوالہ
میں ڈاکٹر بن کر دُکھی انسانیت کی خدمت کروں گی۔

میری زندگی کے مقاصد کے لیے یہ کوپن پر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام .... شہر ....

مقاصد ....

....

میٹھے میاں کی میٹھی عید

نیر رانی شفق

جھیل کنارے ایک خوب صورت قصبہ شاداب نگر آباد تھا۔ اچھے میاں اور پیاری خاتون اپنے جڑواں بچوں میٹھے میاں اور کھٹے میاں کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہے تھے۔ کھٹے میاں اور میٹھے میاں صبح سکول جاتے اور شام کے وقت سکول کا کام ختم کر کے اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلتے، مگر میٹھے میاں کی نسبت کھٹا زیادہ تر کھیلتا رہتا۔ جانوروں اور راہ گیروں کو تنگ کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کے والدین اُسے سمجھاتے تو کچھ دن تو اس پر اثر رہتا، مگر وہ جلد ہی سب کچھ بھلا کر اپنے شرارتی دوستوں کے ساتھ پہلے والی ڈگر پر چل پڑتا، جب کہ میٹھا بچہ واقعی میٹھا تھا۔ وہ سب کا کہنا مانتا۔ بڑوں کا ادب کرتا۔ والدین کی خدمت کرتا اور گھر کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانا وہ عبادت سمجھتا تھا۔ دوستوں کا خیال رکھتا اور ہوم ورک دل لگا کر کرتا۔ کہنے کو تو دونوں جڑواں بھائی تھے، مگر دونوں کی عادات اور مزاج میں بہت فرق تھا۔ میٹھا اپنے گھر، رشتہ داروں، گلی، محلے اور سکول غرض ہر جگہ اپنی اچھی عادات کی وجہ سے مقبول تھا، جب کہ کھٹے میاں کی نافرمانیوں اور شرارتوں کے باعث اکثر لوگ اس سے خائف رہتے تھے۔ سکول جانے سے پہلے جب ان کی امی کہتیں کہ بیٹا جلدی جلدی نہا دھو کر تیار ہو جاؤ، کہیں سکول کے سے دیر نہ ہو جائے تو میٹھے میاں فوراً نہا دھو کر تیار ہو جاتے، مگر کھٹے میاں رونا دھونا شروع کر دیتے کہ ہم نہیں نہائیں گے۔ ابھی پرسوں ہی تو نہائے تھے۔ اس کے والدین سمجھاتے کہ روزانہ نہانا اچھی بات ہوتی ہے۔ روز نہیں نہا سکتے تو کم از کم دُوسرے دن تو نہا لیا کرو، مگر کھٹے میاں کے کان پر تو جوں تک نہ رینگتی تھی۔ اول تو صبح سویرے اٹھنا ہی کھٹے میاں کے لیے قیامت سے کم نہ ہوتا۔ اس کے امی ابو بہت مشکل سے اُسے جگاتے۔ وہ بڑی مشکل سے منہ بسورتے اٹھتے اور نماز کے لیے اچھے ابو اور میٹھے میاں کے ساتھ فجر کی نماز کے لیے جاتے جب کہ کھٹے میاں زیادہ تر بستر پر ہی کروٹیں بدل کر دوبارہ سو جاتے۔ اور جب سکول جانے کا وقت آتا تو روتے دھوتے سکول جاتے۔ وہاں بھی پڑھائی میں دل نہ لگتا۔ دوستوں اور ہم جماعتوں کو تنگ کرتے اور اساتذہ کے ہاتھوں سزا پاتے۔ گھر آ کر کھانا کھاتے تو رونا اور شور مچانا شروع کر دیتے۔ آج ہم یہ کھانا، نہیں کھائیں گے ہمیں کچھ اور پکا کر دیں۔ کھٹے میاں نے اپنی عادتوں کی وجہ سے سب کو زچ کیا ہوا تھا۔

ماہِ رمضان کا آغاز ہوا تو میٹھے میاں سحری کے وقت سب کے ساتھ اٹھتے، سحری کھاتے، روزہ رکھتے، نماز ادا کرتے تھوڑی دیر

آرام کرتے اور صبح اٹھ کر سکول کا کام کرتے جب کہ کھٹے میاں سحری تو کھا لیتے مگر اکثر صبح اٹھ کر دوبارہ ناشتہ کر لیتے اور اگر ناشتہ نہ کرتے تو بارہ بجے تک بھوک بھوک کا شور مچا کر روزہ توڑ لیتے۔ پانچ وقت کی نماز بھی ادا نہ کرتے۔ کبھی عشاء کی نماز پڑھے بغیر سو جاتے۔ کبھی سحری کے بعد فجر کی نماز نہ پڑھتے۔ امی اور ابو انہیں سمجھاتے کہ بیٹا اب آپ پر نماز فرض ہو چکی ہے لہٰذا پانچ وقت کی نماز پڑھا کریں۔ تاکہ اللہ کی رحمتیں نازل ہوں۔ ویسے بھی رمضان میں عبادت کرنے کا دگنا ثواب ملتا ہے۔ ان کی امی اور ابو نے انہیں یہ بھی بتایا کہ غریبوں کو سحری اور افطاری کے وقت کھانا کھلانے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں۔ کیوں کہ روزہ رکھنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم اپنے اخلاق کو سنوارنے کے ساتھ دُوسروں کی بھوک اور پیاس کو بھی محسوس کریں۔ ہمیشہ کی طرح میٹھے میاں نے والدین کی نصیحتوں کو گرہ سے باندھ لیا جب کہ کھٹے میاں نے ان پر کوئی عمل نہ کیا۔ اور کھیل تماشوں میں مصروف رہے۔

میٹھے میاں روزانہ اپنی والدہ سے کھانا لے کر مسجد کے علاوہ محلے اور گردونواح کے غریب لوگوں کو پہنچا کر آتے۔ اور خوشی خوشی

واپس لوٹتے کہ انہیں نیکی کرنے کی توفیق ملی۔

آخر کار عید کا دن قریب آ گیا۔ امی جان نے دونوں بچوں سے کہا:

''بچو! اصل عید کی خوشی اس وقت ملتی ہے۔ جب ہم اس میں اپنے دوستوں، رشتہ داروں اور غریب لوگوں کو شامل کریں۔ لہٰذا اس خوشی کے موقع پر اپنے دوستوں، رشتہ داروں اور غریب لوگوں کو عید کے تحائف ضرور دینے چاہئیں۔ اس سے نہ صرف آپس میں محبت بڑھتی ہے بلکہ اجر وثواب بھی حاصل ہوتا ہے۔''

ان کی امی نے ان کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لیے کچھ تحائف انہیں دیے کہ یہ تحائف رشتہ داروں اور دوستوں کے گھروں میں پہنچا دیجئے۔ اس مرتبہ کھٹے میاں نے کچھ عید کی خوشی میں اور کچھ یہ سوچ کر جواب میں دوست احباب اور رشتہ دار بھی انہیں تحائف اور عیدی دیں گے۔ سب دوستوں اور رشتہ داروں کو میٹھے میاں کی طرح عید کارڈز اور تحائف دیئے۔
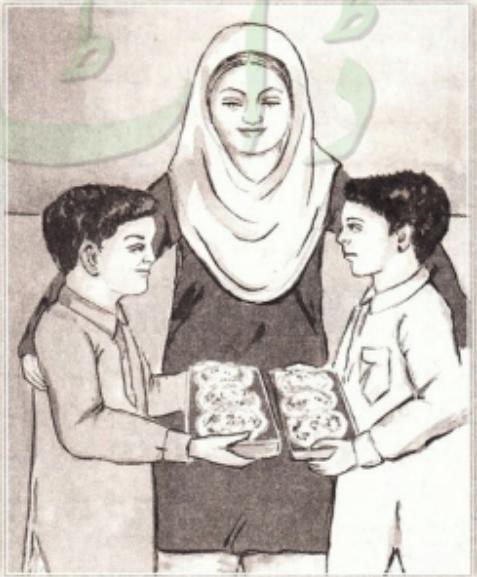
ان کی والدہ نے ان سے کہا: ''اب ایک ایک تحفہ اور عیدی میں آپ کو دے رہی ہوں۔ یہ اس لیے کہ آپ کسی غریب بچے کو تلاش کر کے یہ عیدی اور تحفہ اس بچے کو دیں گے۔ اگر یہ کام آپ دونوں نے احسن طریقے سے سرانجام دیا تو میں آپ لوگوں کو عید کا بہترین تحفہ دوں گی۔''

دونوں خوشی خوشی تحفے اور عیدی لے کر باہر چلے گئے۔ میٹھے میاں نے نہر کے کنارے آباد جھونپڑوں کا رخ کیا اور خاموشی سے وہاں کا جائزہ لیا۔ چوتھی جھونپڑی سے ایک بچی کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اپنی ماں سے کہہ رہی تھی کہ آج آخری روزہ ہے اور کل عید ہو گی، مگر ہم کس طرح عید منائیں گے؟ ہمارے ابو تو فوت ہو چکے ہیں ہمارے پاس تو کھانے کو بھی کچھ نہیں ہے۔ اس کی ماں نے گلوگیر آواز میں جواب دیا:

''عید تو امیروں کی ہوتی ہے ہم غریبوں کی کیا عید؟'' یہ سن کر میٹھے میاں اجازت لے کر جھونپڑی کے اندر چلے گئے اور بولے: ''عید تو ہم سب کے لیے خوشیاں لاتی ہے۔''

"تم کون ہو بچے؟" وہ عورت حیران ہو کر بولی۔

"ہم میٹھے میاں ہیں۔ یہ کپڑے، جوتے، سویاں اور یہ پیسے ہماری امی نے آپ اور اس ننھی بچی کے لیے عید کا تحفہ بھیجے ہیں۔"

وہ عورت دُعائیں دیتی ہوئی بولی:

"بیٹا! خدا کرے تمہارے نام کی طرح تمہارا ہر دن میٹھی عید کی طرح بسر ہو۔" میٹھا خوش خوش گھر آیا اور پیاری امی کو ساری بات بتائی۔ دُوسری طرف کھٹے میاں غریب لوگوں کی تلاش میں نکلے اور راستے میں گفٹ پیک کھول کر دیکھنے لگے۔ اتنے خوب صورت کھلونے کپڑے اور پیسے دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔

"واہ بھئی واہ! اتنے سارے پیسے، کھلونے اور تحائف بھلا ہم کسی اور کو کیوں دیں۔" پھر انہوں نے ساری چیزیں واپس الماری میں لا کر رکھ دیں۔ جب ان کی امی نے پوچھا تو کھٹے میاں نے حسب عادت جھوٹ بولا کہ راستے میں ایک غریب بچہ ملا تھا، سب چیزیں اس کو دے دی ہیں، مگر اس کے چہرے پر خوشی کے وہ رنگ نہ تھے جو غریبوں کو عید کی خوشی میں شامل کرنے پر میٹھے کے چہرے پر تھے۔

اس کی امی سمجھ گئیں اور تحقیق کرنے پر سچ کا پتہ بھی چل گیا۔

افطاری کے بعد چاند نظر آیا تو سب نے ایک دُوسرے کو مبارک باد دی۔

رات کو جب سب سو گئے تو امی نے میٹھے میاں کے سرہانے بہت سے کھلونے اور عید کا نیا سوٹ بھی رکھ دیا۔ آدھی رات کو میٹھے میاں کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ ایک سنہرے پروں والی پری اس کے سرہانے کھڑی ہے۔ میٹھے نے گھبرا کر اٹھنا چاہا تو وہ مسکرا کر بولی:

"میٹھے بچے! میں پری ستان سے ڈھیروں پھول اور تحفے تمہارے لیے لائی ہوں۔ کیوں کہ تم ایک مہربان اور اچھے بچے ہو، جو بچے عید کے موقع پر ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں میں ان کو تحائف دینے آتی ہوں۔" پھر وہ پری تحائف وہاں رکھ کر غائب ہو گئی۔ میٹھے میاں تحائف پا کر بہت خوش تھے جب کہ کھٹے میاں خاموش اور اداس ایک طرف کھڑے سوچ رہے تھے کہ کاش وہ بھی والدین کا کہنا مانتے، غریبوں کی مدد کرتے اور لالچ نہ کرتے تو آج ان کی عید بھی ان کے لیے حقیقی مسرت لے کر آتی۔

مضبوط گھر

حضرت نوحؑ سے ایک عورت نے کہا: "میرے لیے دُعا کریں، میرے بچے ڈیڑھ سو سال کی عمر میں ہی مر جاتے ہیں، میں چاہتی ہوں کہ ان کی زندگی طویل ہو۔" حضرت نوحؑ نے فرمایا: "تجھے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تیرے بچے اس عمر تک پہنچ جاتے ہیں ورنہ ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ عمر ہی پچاس ساٹھ سال کی پائیں گے۔"

عورت نے حیرت سے کہا: "وہ لوگ تو پھر مکان بھی نہیں بنائیں گے اور جھونپڑیوں میں عمر گزار دیں گے۔"
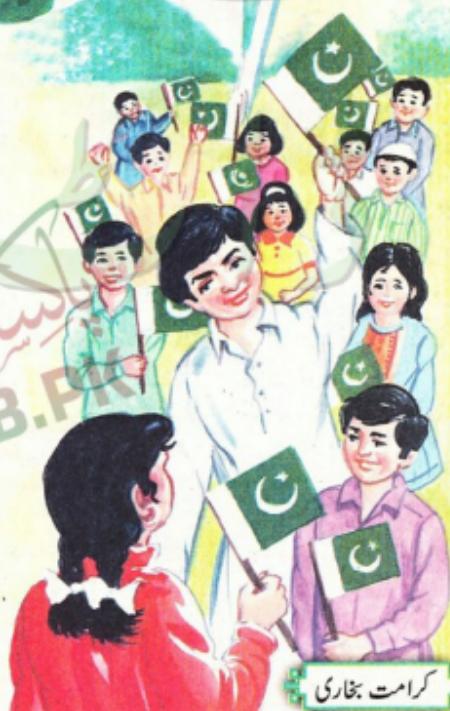
حضرت نوحؑ نے فرمایا: "نہیں سب سے زیادہ مضبوط اور خوب صورت مکان انہی لوگوں کے ہوں گے۔"

(اسماء منیر، سیال کوٹ)
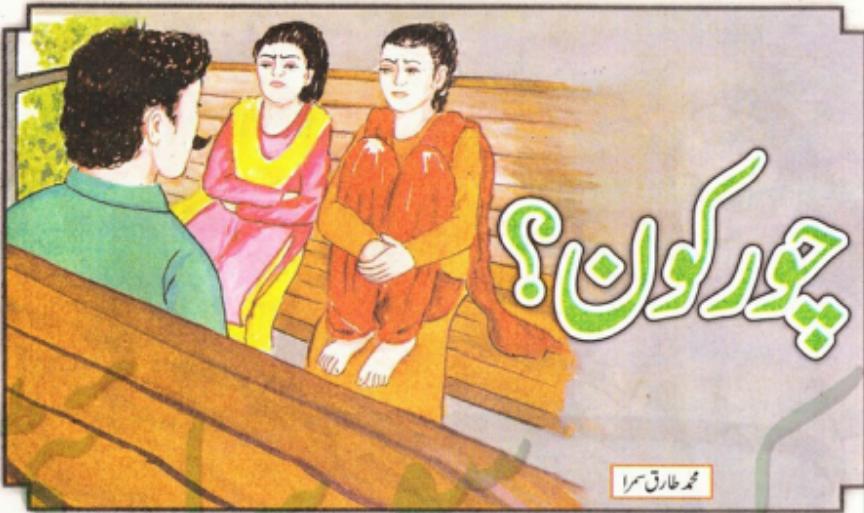
چودہ اگست

چودہ اگست آیا ، چودہ اگست آیا
سب کے نصیب جاگے خوشیوں کو ساتھ لایا

ظلمت کا زور ٹوٹا ، آیا نظر سویرا
آزادیوں کا سورج رب نے ہمیں دکھایا

پرچم یہ پیارا پیارا ، یہ چاند اور ستارا
اللہ کے کرم کا سر پہ ہمارے سایہ

قائد ہمارا سچا تھا قول کا بھی پکا
جینے کا یہ سلیقہ اس نے ہمیں سکھایا

دریا پہاڑ سارے، پھل پھول بھی ہمارے
قدرت نے اِس زمین کو سرسبز ہے بنایا

بچو اِسے بچانا ہر اِک نگاہِ بد سے
یہ ملک ہم نے مل کر مشکل سے ہے بنایا

کرامت بخاری

چور کون؟

محمد طارق سمرا

ان کے آنے سے اے سی کمپارٹمنٹ کا ماحول خاصا خوش گوار ہوگیا تھا۔

وہ چالیس پینتالیس سال کے ایک خوش شکل اور خوش لباس انسان تھے۔ سیاہ رنگ کی پینٹ پر اُجلی اُجلی سفید بے داغ ٹی شرٹ اور چہرے پر سنہرے فریم کی نفیس سی عینک ان کی شخصیت پر خوب سج رہی تھی۔

انکل نے آتے ہی ہمیں ہیلو بوائز کہا اور جھکتے ہوئے پوچھا: ''کیا میں یہاں آپ کے ڈبے میں بیٹھ سکتا ہوں۔'' حالانکہ انہیں یہ بات پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی، ان کے ہاتھ میں پکڑا ریزرویشن کا ٹکٹ واضح دکھائی دے رہا تھا۔ میں عاشی اور نومی قراقرم ایکسپریس پر سفر کررہے تھے۔ قراقرم ایکسپریس وطنِ عزیز کی ان چند ٹرینوں میں سے ایک ہے جن کے ٹکٹ سیٹ بائی سیٹ جاری ہوتے ہیں۔ یعنی جاری ہونے والے تمام ٹکٹوں پر نشستیں محفوظ ہوتی ہیں۔

یہ چھ نشستوں والا کمپارٹمنٹ تھا۔ انکل کے آنے سے پہلے ہم تین کے علاوہ دو اور مسافر بھی کمپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ اور انہی کی وجہ سے ہمیں عجیب سی گھٹن محسوس ہورہی تھی۔ دونوں لمبے ترنگے قد کے مالک تھے۔ چہرے پر بڑی بڑی اور گھورتی ہوئی سیاہ آنکھیں اور بے تحاشا پھیلی ہوئی گھنی مونچھیں عجیب خوف ناک تاثر پیدا کررہی تھیں۔ ان میں سے ایک کے چہرے پر تو باقاعدہ لمبا سا زخم کا نشان بھی تھا۔

میں اور نومی تو جیسے تیسے اپنے آپ پر قابو پائے ہوئے تھے، تاہم عاشی ان کی موجودگی میں کافی پریشان لگ رہی تھی۔ ہم لوگ لاہور سے روانہ ہوئے تھے اور کالج کے امتحانات سے فراغت کے بعد تعطیلات گزارنے چھوٹی خالہ کے ہاں کراچی جارہے تھے۔ جب کہ وہ دونوں خانیوال اسٹیشن سے سوار ہوئے تھے۔ وہ جب سے آئے تھے مسلسل خاموش تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے آپس میں بھی ایک دُوسرے سے بات نہیں کی تھی۔ بس خاموشی سے اپنی نشستوں پر جمے بیٹھے تھے۔ جیسے مناسب وقت اور موقع کی تلاش میں ہوں۔

''مجھے یہ لوگ اچھے آدمی نہیں لگ رہے......!'' انکل کے آنے سے پہلے تک عاشی دو تین مرتبہ میرے کان میں سرگوشی کرچکی تھی۔ میری چھٹی حس تو پہلے ہی عاشی کے شبہ کی تائید کررہی تھی۔ یہ الگ بات کہ میں نے اپنی گھبراہٹ اس پر ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ البتہ نومی کے موبائل پر پیغام بھیج کر اُسے عاشی کی تشویش سے آگاہ کردیا تھا۔ جواب میں نومی نے پیغام بھیجا:

''عاشی میڈم کو جاسوسی ناول پڑھنے کا چسکا ہے! اس لیے اسے ہر آدمی جاسوسی ناولوں کا کردار اور ہر مونچھوں والا غنڈہ بدمعاش

دکھائی دیتا ہے۔''میں نے شرارت سے وہ پیغام عاشی کو بھی پڑھوادیا۔ جس کا نتیجہ صاف ظاہر تھا۔ اس نے خوں خوار نظروں سے میری اور نومی کی طرف دیکھا اور منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

ٹرین بہاول پور سے آگے نکلی تو اچانک کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور انکل مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے خوش دلی سے ہمیں مخاطب کر کے بیٹھنے کی اجازت طلب کی۔ کمپارٹمنٹ کی چھٹی نشست خالی تھی۔ ہمیں بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ ہم تو خود کسی معقول آدمی کی آمد کے منتظر تھے۔ پس انکل جیسے نفیس انسان کی آمد ہمیں بہار کا جھونکا محسوس ہوئی۔ بعد کی گفتگو سے پتہ چلا کہ انکل واقعی باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ خوش دلی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بات بات پر پھلجھڑیاں چھوڑنا اور قہقہے بکھیرنا تو جیسے ان کی عادت ہو۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم ان سے مانوس ہوگئے اور یوں باتیں کرنے لگے جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔

انکل سے باتوں کے دوران نومی کے موبائل فون پر کال موصول ہوئی۔ فون سننے کے بعد نومی نے موبائل فون جیب میں ڈالنے کی بجائے کمپارٹمنٹ کی دیوار سے جڑی میز پر رکھ دیا۔ تب انکل بولے:

''ینگ مین! موبائل اٹھا کر جیب میں رکھو! قیمتی اشیاء کے معاملے میں لاپرواہی نہیں برتنی چاہئے!''

''انکل یہاں سے کس نے اٹھانا ہے موبائل.......؟'' نومی نے لاپرواہی سے جواب دیا

''اتنا پیارا اور قیمتی موبائل ہے۔ کسی کا بھی دل بے ایمان ہو سکتا ہے!'' انکل نے بڑے پُراسرار لہجے میں جواب دیا۔

'' آپ کا تو نہیں ہوگا نا......!'' نومی نے شرارت آمیز لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا پتہ ہو ہی جائے! چور کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ چور ہے!'' انکل نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

انکل کی آمد سے ہمیں بہت حوصلہ ملا تھا اور ان خوف ناک شکلوں والے مسافروں کا ڈر بھی کافی کم ہوگیا تھا۔ تاہم ان کی پُراسراریت ابھی بھی جوں کی توں برقرار تھی۔ وہ نہ تو ہماری گفتگو میں شامل ہوئے تھے اور نہ ہی انہوں نے ہماری ہنسی مذاق کی کسی

بات پر ردعمل ظاہر کیا تھا۔بس گم صم اور بت بنے بیٹھے رہے۔جیسے انہیں کسی نے ہم پر نگران مقرر کیا ہو۔تاہم انکل کے آنے سے یہ ضرور ہوا تھا کہ انہوں نے نے ہمیں مسلسل گھورنے کا عمل بند کردیا تھا اور سر جھکا کر بیٹھ گئے تھے۔ہم تینوں ایک رو میں بیٹھے تھے جب کہ انکل نے ہمارے سامنے کھڑکی کے ساتھ والی نشست سنبھالی ہوئی تھی۔ وہ دونوں ان کے ساتھ اور میں ،عاشی اور نومی کے درمیان میں بیٹھا ہوا تھا۔

ہم لاہور سے چار بجے روانہ ہوئے تھے۔بہاول پور پہنچتے پہنچتے 9 بج گئے تھے۔ٹرین سے باہر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ٹرین اس اندھیرے کو چیرتی ،سیٹیاں بجاتی پوری رفتار سے دوڑی چلی جارہی تھی۔ جب کہ ٹرین کے اندر انکل کی باتیں ماحول کو خوش گوار بنائے ہوئے تھیں؟ لیکن عاشی کا ذہن ابھی بھی ان مسافروں میں اٹکا ہوا تھا۔اس نے سرگوشی کی:

''دیکھو! انکل کے آنے پر کیسے شریف بن کر بیٹھ گئے ہیں۔''

میں عاشی کی بات پر فقط مسکرا کر رہ گیا۔

گیارہ بجے کے لگ بھگ سب کو جمائیاں آنی شروع ہوگئیں۔اب گپ شپ کے ماحول میں وہ پہلا سا جوش بھی نہیں رہا تھا۔ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ انکل ہی کے مشورے پر سب لوگ سونے کے لیے تیار ہوگئے۔فولڈنگ برتھیں کھول دی گئیں۔ ہمارے کچھ کہنے سے قبل ہی وہ دونوں پُراسرار مسافر اُوپر والی برتھوں پر چڑھ گئے۔اور ہم نے شکر کیا کیوں کہ اس طرح ہمارے لیے برتھوں کی تقسیم آسان ہوگئی تھی۔ عاشی نے سب سے نچلی برتھ پر قبضہ جمالیا۔اس کے سامنے والی برتھ پر میں تھا۔ جب کہ درمیانی برتھوں میں سے ایک پر انکل اور دُوسرے پر نومی تھا۔

دونوں پُراسرار مسافر نظروں سے اوجھل ہوئے تو عاشی کو بھی سکون ہوگیا پھر عاشی موٹی چادر سے اچھی طرح خود کو ڈھانپ کر اطمینان سے لیٹ گئی۔ ذرا سی دیر میں میری بھی آنکھ لگ گئی۔نومی تو یوں بھی گھوڑے بیچ کر سونے کا عادی تھا۔میرے سونے سے قبل ہی اس کے خراٹوں کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔کسی لاشعوری تحریک کے نتیجے میں، میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ٹرین رکی ہوئی تھی۔اور انکل اپنا چھوٹا سا بیگ کاندھے پر ڈال کر کمپارٹمنٹ سے باہر نکل رہے تھے۔

''کہاں چل دیے انکل......؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یار ایمرجنسی ہوگئی ہے، واپس جارہا ہوں! گڈ بائے......!''

انکل نے جواب دیا اور ٹرین سے اتر کر تیزی سے چلتے ہوئے پلیٹ فارم کے اندھیرے میں گم ہوگئے۔یہ کوئی غیر معروف اسٹیشن تھا۔کھڑکی سے باہر پیلے بلبوں کی ہلکی ہلکی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔باقی ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔میں نے موبائل پر ٹائم دیکھنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو دھک سے رہ گیا۔جیب موبائل کے وجود سے عاری تھی اور جیب کا بٹن بھی کھلا ہوا تھا۔میں نے بے چینی سے برتھ پر ہاتھ مارا۔وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔لاشعوری طور پر دھیان دونوں مونچھوں والے مسافروں کی طرف گیا۔ دیکھا تو وہ بھی اپنی نشستوں سے غائب تھے۔میں نے نومی کو جھنجھوڑا تو وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔اس کا قیمتی موبائل بھی غائب تھا۔مونچھوں والے مسافروں کو غائب دیکھ کر اس کے ذہن میں بھی وہی بات آئی جو میرے دماغ میں کھلبلی مچا رہی تھی۔ہم دونوں تیزی کے ساتھ ٹرین سے نیچے اتر آئے اور عقابی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔اچانک ہمیں وہ دونوں پلیٹ فارم پر ٹرین کی مخالف سمت میں جاتے نظر آئے۔

''وہ رہے......! بھاگو......! پکڑو ان چوروں کو......!'' میں چلایا۔

میری چیخ و پکار سن کر اگلے ڈبے سے دو پولیس والے بھی برآمد ہوگئے۔اور تیزی سے ہماری طرف لپکے۔

''کیا ہوا......؟'' ان میں سے ایک نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''وہ چور ہیں۔ ہمارے موبائل چرا کر بھاگ رہے ہیں......!''

میں نے ایک طرف اشارہ کرکے فرط جوش سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔پولیس والوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اوران کے پیچھے دوڑ لگا دی۔اگلے ہی لمحے ان کی گدیاں پولیس والوں کے آہنی

ہاتھوں میں دبی ہوئی تھیں۔اور وہ انہیں دھکیلتے ہوئے ہماری طرف لا رہے تھے۔شور سن کر ٹرین کے دیگر مسافر بھی وہاں جمع ہوگئے اور مجمع سا لگ گیا۔

سب کے سامنے ان کی تلاشی لی گئی، لیکن موبائل برآمد نہ ہوئے۔تب پولیس والوں نے اپنے مخصوص انداز میں تفتیش شروع کر دی، لیکن وہ دونوں بالکل خاموش تھے اور بکے بکے کھڑے تھے جیسے انہیں کچھ خبر ہی نہ ہو۔پولیس والوں نے دو چار ہاتھ جمائے تو وہ غوں غاں کرنے لگے۔تب یہ راز کھلا کہ وہ دونوں پیدائشی گونگے بہرے ہیں۔پولیس والوں کے رویے پر وہ سخت حیران و پریشان تھے۔مسافروں میں سے ایک نے جو اشاروں کی زبان جانتا تھا، ان سے بات چیت کر کے انہیں ساری صورت حال بتائی تو ان کے چہروں سے مسکینی ٹپکنے لگی۔انہوں نے اشاروں سے بتایا کہ انہوں نے کوئی موبائل نہیں چرایا اور نہ ہی وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے بلکہ وہ تو سگریٹ کی طلب میں پلیٹ فارم کے آس پاس کسی ٹھیلے کی تلاش میں جا رہے تھے۔جس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کا قیمتی سامان ابھی تک ٹرین کے ڈبے میں ہی موجود ہے۔جو موبائل فونز کی مالیت سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھا۔چند مسافروں اور پولیس والوں نے ہمارے ڈبے میں آ کر دیکھا۔ان کی بات سچ تھی۔جس سے ان کی بے گناہی ثابت ہورہی تھی۔لیکن موبائل تو بہر حال چوری ہوئے تھے۔اب سوال یہ تھا کہ پھر چور کون ہے۔پولیس والے باریک بینی سے موقع کا معائنہ کرنے لگے تب ان کی نظر سیٹ کے نیچے پڑے ایک ٹکٹ پر پڑی۔ہم سے پوچھا گیا تو میں نے فوراً بتا دیا کہ یہ انکل کی ٹکٹ ہے کیوں کہ میں نے اسے اس مخصوص نشان سے پہچان لیا تھا جو ٹکٹ کے کونے پر بنا ہوا تھا اور جب انکل ٹکٹ ہاتھوں میں تھام کر ڈبے میں داخل ہوئے تھے تو میں نے یہ مخصوص نشان دیکھا تھا۔میں نے پولیس والوں کو انکل کے بارے میں ساری تفصیل بتا دی۔تب ایک پولیس والے نے ٹکٹ دیکھا اور مجھے گھورتے ہوئے بولا:

''آپ کو یقین ہے کہ یہ ٹکٹ چھٹے مسافر کا ہے!''میں نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔تب پولیس والا بولا: ''لوجی پھر تو مسئلہ ہی حل ہوگیا۔آپ کے موبائل آپ کے اسی چہیتے انکل نے چرائے ہیں۔یہ دیکھیں! یہ ٹکٹ دو ہفتے پرانا ہے اور چیک ہو چکا ہے۔'' پولیس والے نے باری باری ٹکٹ سب کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا تو مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا ہوا نظر آیا۔اور اگلے ہی لمحے میں چکرا کر سیٹ پر گر گیا۔ایک تو قیمتی موبائل کے چرائے جانے کا دکھ اور دُوسرا دو معصوموں کو اذیت پہنچانے پر ہونے والی شدید ندامت کا بوجھ ......میں بے ہوش نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا......!
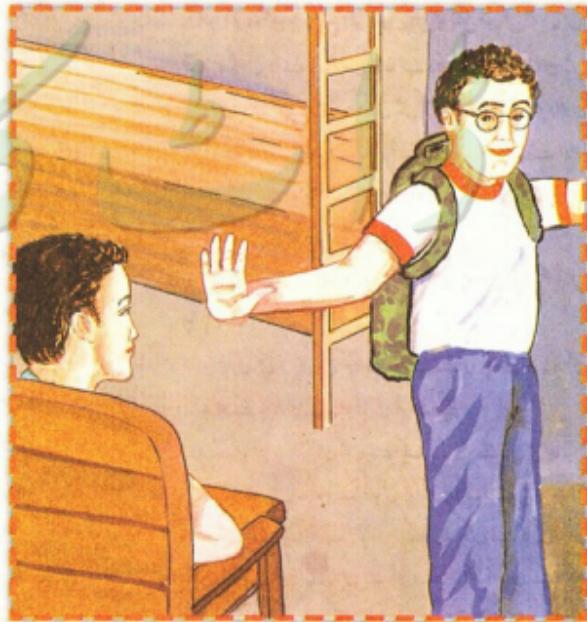
پیسا ٹاور

پیسا(PISA) اٹلی کا مشہور شہر ہے۔ جس کی آبادی ایک لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ یوں تو پورے اٹلی میں کئی مقامات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان میں پیسا کا ٹاور خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جسے عموماً THE LEANING TOWER یا جھکا ہوا

مینار بھی کہتے ہیں۔ اس کی تعمیر 1147ء میں BONANND PISAND نے شروع کروائی۔ جب اس کی تیسری منزل بنی تو یہ عمارت ایک طرف کو زمین میں دھنسنا شروع ہوگئی۔ 90 برس تک یہ ٹاور اسی حالت میں رہا۔ 14 ویں صدی میں TOMMAND SIMONE نے ٹاور کی بالائی منزل تعمیر کروائی جسے کراؤن کہا جاتا ہے۔ پیسا ٹاور پر اُوپر جانے کے لیے 294 سیڑھیاں ہیں۔ عمارت ایک سلنڈر نما شکل کی ہے جس میں 6 گیلریاں ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے یہ عمارت ہر سال ایک ملی میٹر جھک رہی ہے، لیکن اس ٹاور کی پائے داری کا یہ عالم ہے کہ اتنی صدیوں کے بعد بھی یہ زمین بوس نہیں ہوا۔ ٹاور کی اُونچائی 55.86 میٹر (183.27 فٹ) جب کہ بنیادوں سے دیوار 4.09 میٹر (13.42 فٹ) اور بلندی 2.48 میٹر (8.14 فٹ) ہے۔ اندازاً اس ٹاور کا وزن 14500 میٹرک ٹن ہے۔ دُنیا بھر سے سیاح اس ٹاور کو دیکھنے آتے ہیں۔ اس کا شمار بھی دُنیا کی ان عمارتوں میں ہوتا ہے جن کی ہر سال لاکھوں تصاویر کھینچی جاتی ہیں۔

مرغی

یقیناً آپ نے بارہا مرغیوں کے انڈے اور گوشت کی ڈشیں کھائی ہوں گی۔ مرغی کا سائنسی نام GALLUS GALLUS DOMESTICUS ہے۔ یہ دیسی مرغیاں ہیں۔ جو گہرے سرخی مائل پر رکھتی ہیں۔ ان کا تعلق PHASIANIDAE خاندان

سے ہے۔ مرغے کو ROOSTER یا COCK اور مرغی کو HEN کہا جاتا ہے۔ یہ پالتو جانور ہے۔ شاید دُنیا میں کوئی اور پرندہ اتنی بڑی تعداد میں موجود ہو۔ کیوں کہ 2003 میں مرغیوں کی دُنیا بھر میں تعداد 24 ارب ریکارڈ کی گئی تھی۔ مرغبانی یعنی مرغیاں پالنا ایک شوق بھی ہے اور پیشہ بھی۔ مرغبانی کو "پولٹری فارمنگ" کہا جاتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مرغیاں پالنے کی ابتداء ایشیاء سے ہوئی تھی۔ بعد ازاں اہلِ مصر اور اہلِ یورپ اس طرف راغب ہوئے۔ جوان مرغی کو HEN اور نوجوان مرغی کو PULLETS کہا جاتا ہے۔ مرغ کے پر اور کلغی اُسے مرغیوں سے ممتاز کرتی

ہے۔ مرغ سارا دن بانگ دیتا ہے۔ جسے SHRILL CALL کہا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت اعلان ہوتا ہے کہ یہ علاقہ میرا ہے۔ انڈونیشیا کے ہندوؤں میں مرغیوں کو برائی سے بچانے والی مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے وہ اپنے مندر میں مرغا لے کر جاتے ہیں اور واپس لا کر گھر میں چھوڑتے ہیں کہ یہ برائیوں کو گھر میں آنے سے روکے گا۔ مرغی کے انڈے میں سفیدی کو ALBUMEN کہا جاتا ہے۔ انڈے کا چھلکا کیلشیم کی وجہ سے سفید دکھائی دیتا ہے۔ اب مرغیوں کی ایسی اقسام بھی ہیں جو گوشت زیادہ پیدا کرتی ہیں۔ انہیں ''برائلر'' کہا جاتا ہے جب کہ انڈوں کے لیے خاص مرغیوں کو ''لیئر'' کہا جاتا ہے۔ مرغیوں کی کچھ اقسام 300 سو انڈے سالانہ دیتی ہیں۔ انڈوں کا رنگ سفید، براؤن، نیلا یا جامنی ہو سکتا ہے۔ مرغی کے انڈے سے 21 دن میں چوزے نکل آتے ہیں۔

اوزون

اوزون (OZONE) ایک گیس ہے جو ایک آکسیجن مالیکیول اور ایک آکسیجن ایٹم سے مل کر بنتی ہے۔ ہمارا آسمان اسی کی وجہ سے نیلگوں دکھائی دیتا ہے۔ اوزون کی چادر (LAYER) نے ہمارے کرۂ ارض کو گھیر رکھا ہے۔ اسی وجہ سے سورج سے آنے والی خطرناک شعاعیں جنہیں ہم الٹرا وائلٹ ریڈی ایشنز کہتے ہیں ہماری زمین تک نہیں آ سکتیں۔ کیوں کہ یہ گیسی غلاف ان شعاعوں کو جذب کر لیتی ہیں۔ اوزون کا غلاف ہماری زمین سے 30 کلومیٹر سے 50 کلومیٹر بلند ہے۔ اگر یہ تہہ نہ ہوتی تو دُنیا کے انسان اور جانور کینسر کا شکار ہو جاتے۔ جب کہ پودے جھلس جاتے۔ اوزون کی

تفصیل پہلی بار "C.F.SCHONBEIN" نے 1840ء میں پیش کی۔ لفظ اوزون یونانی زبان کے لفظ "OZEIN" سے لیا گیا ہے۔ جس کا مطلب ہے سونگھنا (TO SMELL) اس کا کیمیائی فارمولہ O_3 ہے۔ جس کا تعین 1865ء میں J.LOUIS SORET نامی سائنس دان نے کیا۔ یہ نیلی مائل گیس ہے۔ پانی میں قدرے حل ہو جاتی ہے۔ سانس کے ذریعے یہ گیس انسانی جسم میں داخل ہو تو ناک میں کھجلی پیدا کرتی ہے۔ اس کی موجودگی میں سر میں درد ہوتا ہے اور آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ یہ پھیپھڑوں کو نقصان دیتی ہے۔ پرفیومز، ائیر کنڈیشنز اور ریفریجریٹرز سے کلوروفلوروکاربنز (CFC) خارج ہوتے ہیں جو اوزون کی تہہ کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ وہ جگہ جہاں اوزون کی تہہ کو نقصان پہنچتا ہے اُسے اوزون ہول (OZONE HOLE) کہا جاتا ہے۔ 1980ء میں پہلی بار معلوم ہوا کہ CFC مرکبات کی وجہ سے انٹارکٹکا (ANTARCTCA) میں اوزون کی تہہ کو نقصان پہنچا ہے، جس کی وجہ سے دُنیا کے موسم بدل رہے ہیں۔

مختصر معلومات

(دانیال احمد، کراچی)

- پاکستان کا سب سے بڑا دریا دریائے سندھ ہے۔
- پاکستان کی سب سے لمبی سرنگ کھوجک ہے۔
- پاکستان کا سب سے بڑا شہر (بلحاظ آبادی) کراچی ہے۔
- پاکستان کے پہلے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح تھے۔
- پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان تھے۔
- پاکستان کو سب سے پہلے ایران نے تسلیم کیا۔
- پاکستان کا پہلا سکہ 1948ء میں جاری ہوا۔
- پاکستان کا سرد ترین مقام زیارت ہے۔

چوری

دو کاروباری حضرات گفتگو کر رہے تھے۔ ایک نے کہا ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ اشتہار کا نتیجہ کتنی جلدی ظاہر ہو جاتا ہے؟''
دُوسرے نے کہا: ''ہاں مجھے معلوم ہے، پرسوں میں نے اخبار میں گھر کے چوکی دار کے لیے اشتہار دیا تھا اور کل ہمارے ہاں چوری ہوگئی۔''
(محمد عثمان قاسمی، جھنگ صدر)

کاش

ایک بادشاہ مرگیا۔ اس کے جنازے پر لاکھوں کا ہجوم دیکھ کر ایک شخص کہنے لگا: ''کاش...... آج اگر بادشاہ زندہ ہوتا تو اپنے جنازے پر اتنے آدمی دیکھ کر کتنا خوش ہوتا۔''
(محمد حسنین معاویہ، ڈیرہ اسماعیل خان)

دھوپ

ایک شخص ڈاکٹر کے پاس گیا اور ڈاکٹر سے کہا: ''مجھے بیماری ہے کہ میں نہ کھاؤں تو بھوک لگتی ہے نہ سوؤں تو نیند نہیں آتی، زیادہ کام کرنے سے تھک جاتا ہے۔''
ڈاکٹر: ''بھائی! ساری رات دھوپ میں بیٹھے رہو، ٹھیک ہو جاؤ گے۔''
(علی رضا چاند، بھابڑہ)

میرے ابو

بچہ (فون پر) ''آج میرا بچہ بیمار ہے وہ سکول نہیں آسکتا۔''
ماسٹر: (پہچان کر) ''اور فون پر کون بول رہا ہے؟''
بچہ (گھبرا کر) ''ماسٹر صاحب! فون پر میرے ابو بول رہے ہیں۔''
(شانزہ کومل، کلورکوٹ)

مچھر

ایک شخص رات کو مچھر مار کوائل جلا کر میٹھی نیند سو رہا تھا کہ اچانک اُسے مچھر کی مخصوص آواز سنائی دی۔ وہ شخص حیران ہوا کہ کوائل جلانے کے باوجود مچھر کیسے آ گیا؟ اُس نے عالم غنودگی میں مچھر کو مٹھی میں بند کر لیا اس سے قبل کہ وہ مچھر کو مسل دیتا، مچھر نے گڑگڑاتے ہوئے کہا:
''رحم حضور رحم! میری کیا مجال کہ میں آپ کے آرام میں مخل ہوتا، میں تو دراصل آپ کو یہ بتانے آیا تھا کہ آپ کی کوائل ختم ہو چکی ہے۔''
(مدیحہ مسعود، لاہور)

99 رنز

ایک لڑکا کرکٹ کھیل کر واپس آیا تو باپ نے پوچھا: ''تم نے کتنے رنز بنائے ہیں؟''
لڑکا بولا: ''سنچری ہونے میں صرف 99 رنز باقی تھے کہ میں آؤٹ ہوگیا۔''
(صفیہ زیب، تربیلا ڈیم)

فری

سیلز مین: ''بھائی! یہ لال بیگ کا پاؤڈر لے جائیں۔''
آدمی: ''نہ جی نہ لال بیگ کو اب اتنا بھی فری نہیں کرنا، اب پاؤڈر لے گیا تو اگلی بار باڈی سپرے مانگیں گے۔''
(صبا شاہین، اٹک)

فکر

ایک عورت حیوانات کے ڈاکٹر کے پاس جا کر کہنے لگی: ''میرے کتے نے پٹرول پی لیا ہے اور صحن میں مسلسل چکر لگا رہا ہے، مجھے کیا کرنا چاہیے؟''
ڈاکٹر نے کہا: ''فکر کی کوئی بات نہیں جب پٹرول ختم ہو جائے گا تو کتا خود بخود رک جائے گا۔''
(ظہور احمد، تاندلیانوالہ)

پچاس روپے

ایک دوست (دُوسرے سے): ''مجھے پچاس روپے اودھار دو۔''
دُوسرا دوست: ''لیکن میرے پاس تو صرف تیس روپے ہیں۔''
پہلا دوست: ''لاؤ تیس روپے ہی دے دو، بیس روپے تم پر ادھار رہے۔''
(شاہ بہرام انصاری، ملتان)

لندن اولمپکس 2012ء

نسرین شاہین

27 جولائی سے برطانیہ کے شہر لندن میں 30 ویں اولمپکس گیمز کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ گیمز 12 اگست تک جاری رہیں گی۔ لندن کو تیسری بار اولمپکس گیمز کے انعقاد کا اعزاز ملا ہے۔ اس سے قبل 1908ء اور 1948ء میں لندن میں اولمپکس گیمز کا انعقاد ہوا تھا۔ آیئے ذرا اولمپکس کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں۔

قدیم یونان کے مقام اولمپیا میں ہر چوتھے سال کھیلوں کے مقابلے منعقد ہوتے تھے۔ پہلا باقاعدہ مقابلہ ۷۷۶ قبل مسیح ہوا۔ یہ میدان کے ایک چکر کی دوڑ تھی اور اسے سٹیڈ (Stade) کہتے تھے۔ اسی سے لفظ سٹیڈیم نکلا، فاصلہ تقریباً دو سو گز کا تھا۔ چودھویں مقابلوں میں اس سے دُگنے فاصلے کی دوڑ (تقریباً اڑھائی میل، جو سٹیڈیم کے بارہ چکر ہوتے تھے) پروگرام میں شامل ہوئی۔ اٹھارویں کھیل میں سپہ گر قسم کے لوگوں کے لیے پینٹا تھلان (Pentathlon) کے نام سے ایک مقابلہ شروع کیا گیا۔ اس میں ہر کھلاڑی کو پانچ کھیلوں میں اپنی برتری ثابت کرنا ہوتی تھی۔ ان میں لمبی چھلانگ، نیزہ پھینکنا، سٹیڈ دوڑ، ڈسکس پھینکنا اور کشتی شامل تھی۔ بعد میں مکے بازی اور کشتی کے علیحدہ مقابلے بھی شروع ہوئے اور سٹیڈیم کے قریب ہپوڈ روم (Hippodrome) میں رتھ دوڑوں کے مقابلے ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ کئی اور کھیل بھی کھیلے جانے لگے۔

آغاز میں اولمپک مقابلے صرف یونانی نسل کے نوجوان کے لیے مخصوص تھے۔ اولمپک کھیلوں کے ساتھ قدیم یونان کی بعض مذہبی روایات بھی وابستہ تھیں۔ پہلے پہل یہ جشن صرف ایک دن رہتا تھا۔ بعد میں اس کی تقریبات پانچ دن جاری رہنے لگیں۔

یونان کی مختلف ریاستیں آپس میں لڑتی رہتی تھیں، لیکن اولمپک کھیلوں کا وقت صلح کا دور تصور ہوتا تھا۔ قدیم یونانی ادب اور فنونِ لطیفہ اولمپک تحریک سے کافی متاثر ہوئے۔ پانچویں صدی قبل مسیح اولمپک کھیلوں کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد یونانیوں کی سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوا تو ان کھیلوں کو بھی زوال آ گیا۔ ۳۹۳ء میں رومی شہنشاہ تھیوڈ وسیس اول نے حکماً اولمپک کھیلوں کو بند کر دیا۔

انیسویں صدی عیسوی میں اولمپک تحریک میں از سرنو دل چسپی لی جانے لگی۔ مشہور فرانسیسی عالم بیرون پی ایرڈے کو برتین کی کاوشوں سے ۱۸۹۶ء میں یونان کے دارالحکومت ایتھنز میں زمانہ قدیم کے اولمپک کھیلوں کا آغاز ہوا۔ یہ کھیل ہر چوتھے سال دُنیا کے مختلف شہروں میں منعقد ہوتے ہیں، مگر دو عالم گیر جنگوں کی وجہ سے ۱۹۱۶ء، ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۴ء میں یہ کھیل نہ ہو سکے۔ ان کھیلوں کا مقصد دُنیا بھر کے کھلاڑیوں میں صحت مندانہ مقابلے کا جذبہ پیدا کرنا اور عالمی بھائی چارے کو فروغ دینا ہے۔ ان کھیلوں نے رنگ ونسل کے امتیازات ختم کر دیئے ہیں۔ یہی بات مذہبی اور سیاسی اختلافات کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔

جدید اولمپک کھیل عالمی پیمانے پر منعقد ہوتے ہیں۔ دُنیا کے ہر گوشے کے کھلاڑی ہزاروں کی تعداد میں شرکت کے لیے آتے ہیں۔ آج کل ایتھلیٹکس، باسکٹ بال، باکسنگ، سائیکلنگ، فٹ بال، پیراکی، ہاکی، جمناسٹک، کشتی، گھڑ سواری، ویٹ لفٹنگ، نشانہ بازی، شمشیر زنی، سپہ گری، کشتی رانی، واٹر پولو، کینوئنگ (Canoeing) اور بادبانی (Yachting) کے مقابلے ہوتے ہیں۔

قدیم اولمپک کھیلوں میں جیتنے والے کا انعام زیتون کے پتوں کا تاج ہوتا تھا، جو اس کے سر پر پہنایا جاتا تھا۔ جدید مقابلوں میں اوّل، دوم اور سوم آنے والے کھلاڑیوں کو بالترتیب سونے چاندی اور کانسی کے تمغے دیے جاتے ہیں۔ جدید اولمپک کھیل شہروں کی طرف سے منعقد کرائے جاتے ہیں۔ ہر دفعہ اولمپک کھیلوں کے لیے کئی شہر اُمیدوار ہوتے ہیں۔ انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی ان کی درخواستوں پر غور کر کے کسی ایک کے حق میں فیصلہ دیتی ہے۔

پاکستان ۱۹۴۸ء سے اولمپک کھیلوں میں شرکت کر رہا ہے۔ ۱۹۶۰ء کے کھیلوں میں جو روم (اٹلی) میں ہوئے تھے، پاکستان نے طلائی تمغہ جیتا۔ بعد ازاں ۱۹۶۸ء کے میکسیکو اولمپکس اور ۱۹۸۴ء کے لوس اینجلس اولمپکس مین پاکستان نے ہاکی میں طلائی تمغہ حاصل کیا اور اس طرح ہاکی میں عالمی برتری قائم کی۔

قدیم اولمپک کھیلوں کے جشن کا ایک اہم جزو یونانیوں کی مذہبی تقریبات تھیں۔ ان میں سے بعض تقریبات جدید اولمپک کھیلوں کے موقع پر بھی منعقد ہوتی ہیں، اگرچہ ان کی اہمیت اب محض رسمی ہے۔ سب سے پہلے اولمپک مشعل روشن کی جاتی ہے۔ قدیم اولمپک کھیلوں کے جائے وقوع، اولمپیا میں زیئس دیوتا کے مندر کے کھنڈرات میں سورج کی شعاعیں آتشی شیشے میں سے گزار کر ایک مشعل روشن کی جاتی ہے۔ یہ مشعل ایک نوجوان یونانی عورت کے ہاتھ میں ہوتی ہے جس نے قدیم دیویوں کا سا لباس پہنا ہوتا ہے۔ اس کے گرد اسی قسم کا لباس پہنے خدمت گار عورتیں ہوتی ہیں۔ دیوی ایک یونانی جوان کو مشعل تھما دیتی ہے، جو اُسے لے کر دوڑنا شروع کر دیتا ہے۔ ایک مقررہ فاصلے تک دوڑنے کے بعد یہ مشعل دُوسرے آدمی کو دے دی جاتی ہے۔

اس مشعل کو ہر وقت روشن رکھا جاتا ہے اور اسے حسبِ موقع بحری یا ہوائی جہاز کے ذریعے منزلِ مقصود کے قریب پہنچایا جاتا ہے۔ یہاں سے پھر اُسے لے کر دوڑنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ آخری آدمی اُسے لے کر عین افتتاحی تقریب کے موقع پر سٹیڈیم میں داخل ہوتا ہے۔ سٹیڈیم کا ایک پورا چکر لگانے کے بعد وہ شعلے کو ایک خاص طور سے تیار شدہ آتش دان میں منتقل کر دیتا ہے۔

جدید اولمپک کھیل دو ہفتے تک جاری رہتے ہیں اور اس دوران میں شعلے کو ہر وقت جلتے رکھنے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ سٹیڈیم میں شعلہ روشن کرنے سے پہلے تمام حصہ لینے والے کھلاڑیوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ سب سے آگے یونان کے کھلاڑی داخل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد میزبان ملک کی زبان کے حروف ابجد کے اعتبار سے تمام ملکوں کے کھلاڑی آتے ہیں۔ میزبان ملک کے کھلاڑی سب سے آخر میں ہوتے ہیں۔ ہر ملک کے کھلاڑیوں کے آگے اس ملک کا جھنڈا اور ایک تختے پر ملک کا نام ہوتا ہے۔ اس کے بعد میزبان ملک کا وزیراعظم یا صدر کھیلوں کے افتتاح کا اعلان کرتا ہے۔ نقارے بجائے جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ موسیقی کے ساتھ اولمپک جھنڈا بلند کیا جاتا ہے۔ پھر کبوتر چھوڑے جاتے ہیں اور تین توپوں کی سلامی دی جاتی ہے، اس لمحے اولمپک مشعل

سٹیڈیم میں داخل ہوتی ہے۔ پھر اولمپک حلف اٹھایا جاتا ہے۔ تمام ملکوں کے جھنڈے اٹھانے والے نصف دائرہ بناتے ہیں۔ میزبان ملک کا ایک کھلاڑی اپنے علم بردار کو لے کر آگے بڑھتا ہے اور تمام حصہ لینے والے کھلاڑیوں کی جانب سے کھیل کے اصولوں پر کاربند رہنے کا حلف اٹھاتا ہے۔ اس کے بعد میزبان ملک کا ترانہ بجایا جاتا ہے اور پھر مختلف کھیلوں کے مقابلے، پروگرام کے مطابق شروع ہو جاتے ہیں۔

اولمپک جھنڈا سفید کپڑے کا ہوتا ہے۔ وسط میں پانچ رنگین دائرے زنجیر کی صورت میں ملے ہوتے ہیں۔ جھنڈے کی سلاخ کی طرف نیلا، پھر زرد، سیاہ، سبز اور سرخ دائرے پانچ براعظموں کی اولمپک تحریک میں شمولیت ظاہر کرتے ہیں۔ یہ جھنڈا پہلے پہل ۱۹۲۰ء میں استعمال ہوا تھا، ساٹن کا بنا ہوا اصل جھنڈا ہر دفعہ اولمپک کھیلوں کے موقع پر ایک میزبان شہر سے دُوسرے کو پہنچایا جاتا ہے۔ یہ دائرے اولمپک نشان تصور ہوتے ہیں۔ تمام ملکوں میں ان کا استعمال، سوائے اولمپک تحریک کے سلسلے میں، قانوناً منع ہے۔ یہی صورت اولمپک ماٹو (ہمیشہ تیز تر، ہمیشہ بلند تر، ہمیشہ مضبوط تر) کی ہے۔ ہر کھیل کے مقابلے کے بعد فتح کی تقریب ہوتی ہے۔ ایک خاص چبوترے پر اوّل آنے والا کھلاڑی (ٹیم کی صورت میں کپتان) درمیان میں بلند جگہ پر کھڑا ہوتا ہے، دوم آنے والا کھلاڑی اس کی دائیں جانب اور سوم بائیں طرف۔ دونوں ذرا نیچے ہوتے ہیں۔ کوئی معزز فرد ان کو تمغے دیتا ہے، اور پھر ان تینوں کے قومی جھنڈے ان کے پیچھے اسی ترتیب سے بلند ہوتے ہیں۔ اوّل آنے والے کھلاڑی کے ملک کا قومی ترانہ بجتا ہے اور یہ تینوں جھنڈوں کی طرف منہ کر کے سلامی دیتے ہیں۔

اختتامی تقریب کے موقع پر تمام کھلاڑیوں کا دوبارہ اجتماع ہوتا ہے۔ یونان، میزبان ملک اور آئندہ مقابلوں کے میزبان ملک کے جھنڈوں کو سلامی دی جاتی ہے۔ انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی کا صدر آئندہ اولمپک کھیلوں میں شرکت کی دعوت دُنیا بھر کے نوجوانوں کو دیتا ہے اور میزبان ملک کا سربراہ کھیلوں کے اختتام کا اعلان کرتا ہے۔ پھر نقارے بجتے ہیں، موسیقی کے ساتھ اولمپک شعلہ بجھایا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ اولمپک جھنڈا اتار لیا جاتا ہے۔ اس موقع پر توپوں کی سلامی دی جاتی ہے۔

سب سے طویل دورانیے کے اولمپکس ۱۹۰۰ء میں پیرس میں ہوئے جو ۵ ماہ اور ۸ دن جاری رہے، سب سے کم دورانیے کے اولمپکس ۱۸۹۶ء میں ۱۰ دن جاری رہے۔ ۱۹۸۰ء میں افغانستان میں روسی فوجوں کی مداخلت کی وجہ سے پاکستان سمیت امریکا اور یورپی ممالک نے ان مقابلوں کا بائیکاٹ کیا تھا۔

سب سے پہلے ٹیلی ویژن پر اولمپکس کھیلوں کے مقابلے ۱۹۳۶ء میں صرف جرمنی کے شہر برلن میں دکھائے گئے کیوں کہ اس وقت ٹیلی ویژن نشریات کا دائرہ اس قدر وسیع نہ تھا جتنا کہ آج ہے۔ ۱۹۶۰ء میں روم اولمپکس کے مقابلے امریکا میں بھی دیکھے گئے جب کہ ۱۹۶۴ء میں ٹوکیو اولمپکس ناظرین کے لیے براہ راست ٹی وی پر پیش کیے گئے، اس کے بعد دُنیا بھر میں اولمپکس مقابلوں کو دکھایا جانے لگا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ٹیلی ویژن کمپنیوں اور اداروں کو خطیر رقم خرچ کرنا پڑتی ہے۔

لندن اولمپکس 2012ء میں 4 ہزار 700 میڈلز تقسیم کیے جائیں گے۔ اس حوالے سے وزیر اولمپکس ہگ رابرٹسن نے کہا کہ سونے، چاندی اور کانسی کے 4 ہزار 700 میڈلز بھی شاہی جواہرات کی طرح قیمتی ہیں، لہٰذا انہیں محفوظ مقام پر رکھنا انتہائی ضروری ہے تاکہ کوئی چور ان تک پہنچ نہ سکے۔ میڈلز کی تیاری میں 8 ٹن سے زائد خالص سونا، چاندی اور تانبا استعمال ہوا ہے۔ اولمپک کا سب سے بڑا انعام یعنی گولڈ میڈل 92.5 فیصد چاندی، 1.34 فیصد سونا جب کہ 6.16 فیصد تانبے سے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں کم از کم 6 گرام سونا شامل ہے۔ اسی طرح چاندی کا تمغہ 92.5 فیصد چاندی اور باقی تانبے کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ جب کہ کانسی کے تمغے میں 97 فیصد کانسی، 2.5 فیصد جست اور 0.5 فیصد ٹن کی آمیزش ہے۔ میڈلز کی تیاری کے لیے کان کنی کی فرم ریوٹنٹو نے امریکی ریاست اوتاہ میں سالٹ لیک سٹی کی تانبے کی کان اور منگولیا میں ایوٹو لگوائے پروجیکٹ سے خام مال حاصل کیا ہے۔ ☆☆

معلوماتِ عامہ

- پاکستان کی سب سے بڑی جھیل منچھر جھیل ہے۔
- پاکستان کا پہلا ٹیلی ویژن اسٹیشن 1964ء میں لاہور میں قائم ہوا تھا۔
- پاکستان کی سب سے بڑی مسجد شاہ فیصل مسجد اسلام آباد میں ہے۔
- پاکستان کا سب سے بڑا ڈویژن (بلحاظ رقبہ) قلات ہے۔
- پاکستان کی سب سے بڑی نہر اپر راوی کینال ہے۔
- پاکستان کی سب سے خوب صورت جھیل سیف الملوک ہے۔
- پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ (بلحاظ آبادی) پنجاب ہے۔
- پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ (بلحاظ رقبہ) بلوچستان ہے۔
- پاکستان کا سب سے چھوٹا بند وارسک بند ہے۔
- پاکستان کا پہلا ڈاک ٹکٹ 1956ء میں جاری ہوا تھا۔
- پاکستان کے پہلے چیف جسٹس میاں عبدالرشید تھے۔
- پاکستان کا گرم ترین مقام جیکب آباد ہے۔
- پاکستان کا پہلا موسمیاتی سیارہ رہبر اول ہے۔

(انجینئر فانی، بہاول نگر)

- پاکستان کا پہلا آئین 23 مارچ 1956ء دُوسرا آئین 8 جون 1962ء اور تیسرا آئین 14 اگست 1973ء کو ملک میں نافذ العمل کیا گیا۔
- پاکستان کے خلائی تحقیق کے ادارے کا نام ''سپارکو'' ہے۔
- پاک چین سرحد 592 کلومیٹر لمبی ہے۔
- پاک افغان سرحد 2250 کلومیٹر ہے۔
- پاک ایران سرحد 800 کلومیٹر لمبی ہے۔
- پاک بھارت سرحد 1600 کلومیٹر لمبی ہے۔
- پاکستان میں کُل 880 ریلوے اسٹیشن ہیں۔
- جی ٹی روڈ کی لمبائی 1750 کلومیٹر ہے۔
- پی آئی اے کا قیام 1950ء میں عمل میں آیا تھا۔
- پاکستان میں کُل 36 ائیر پورٹ ہیں۔

(وقار اشرف، اسلام آباد)

- دُنیا کا سب سے بڑا کتب خانہ امریکی کانگریس کا ہے، واشنگٹن میں موجود اس لائبریری کی عمارت تیرہ ایکڑ قطعہ اراضی پر مشتمل ہے۔ اس کتب خانے میں تین کروڑ انسٹھ لاکھ کتب ہیں۔
- دُنیا کی طویل ترین نظم مہا بھارت ہے۔ جسے کالی داس نامی شخص نے 150 قبل مسیح میں لکھا۔ اس نظم میں ایک لاکھ دس ہزار اشعار ہیں اور یہ تیس کروڑ الفاظ پر مشتمل ہے۔

(منازل فرسان، راول پنڈی)

- دُنیا میں آزاد اسلامی ممالک 57 ہیں۔
- دُنیا میں سب سے میٹھے پانی والی جھیل سپیرئر جھیل ہے۔
- دُنیا کا سب سے بڑا پارک کینیڈا میں ہے۔
- نوٹوں کا آغاز سب سے پہلے چین میں ہوا۔
- انسان کے جسم میں 24 پسلیاں ہوتی ہیں۔
- سائنس دان ڈاکٹر کارل کو چیونٹیوں کی زبان کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔
- دُنیا میں سونے کی سب سے بڑی کانیں جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں ہیں۔

(ظہور احمد، تاندلیانوالہ)

- پاکستان کا دارالحکومت اسلام آباد ہے۔
- بھارت کا دارالحکومت دہلی ہے۔
- امریکہ کا دارالحکومت واشنگٹن ہے۔
- انگلستان کا دارالحکومت لندن ہے۔
- فرانس کا دارالحکومت پیرس ہے۔
- آسٹریلیا کا دارالحکومت سڈنی ہے۔
- چین کا دارالحکومت بیجنگ ہے۔
- جاپان کا دارالحکومت ٹوکیو ہے۔
- بنگلہ دیش کا دارالحکومت ڈھاکہ ہے۔
- جرمنی کا دارالحکومت برلن ہے۔
- میکسیکو کا دارالحکومت میکسیکو سٹی ہے۔

(علی شہروز، فیصل آباد)

قومی ترانے کی کہانی

رانا محمد شاہد

14 اگست 1947ء کو پاکستان معرض وجود میں آیا تو اس کا اپنا کوئی ترانہ نہیں تھا۔ قومی تقریبات پر غیر ملکی لوگوں کا بھی آنا جانا لگا ہوا تھا۔ اس وقت حکومتِ پاکستان نے محسوس کیا کہ دُوسرے ممالک کی طرح پاکستان کا بھی قومی ترانہ ہونا چاہیے۔ شہید ملت لیاقت علی خان (جو اس وقت وزیراعظم تھے) نے بھی قومی ترانے کے لیے کوششیں شروع کیں۔ جس کے بعد وزیرِ اطلاعات نے مختلف اخبارات میں ایک اشتہار شائع کرایا، جس میں لکھا گیا کہ پاکستان کا ترانہ اور دھن تیار کروانے والے شخص کو 10 ہزار روپے انعام دیا جائے گا۔ اگر دو لوگ شاعری اور دھن علیحدہ علیحدہ لائیں گے تو دس ہزار کی رقم ان میں برابر تقسیم کی جائے گی، لیکن اس اشتہار کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکل سکا۔

اس اشتہار کی اشاعت سے چند ماہ پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان راول پنڈی آئے تھے جہاں ان کی ملاقات حفیظ جالندھری سے ہوئی تھی۔ اس ملاقات میں شہیدِ ملت نے حفیظ جالندھری سے قومی ترانہ لکھنے اور بعد میں اس کی دھن تیار کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر حفیظ جالندھری نے دھن تیار کرنے کے لیے موسیقی کے آلات اور سازندوں وغیرہ کی مدد چاہی۔ اس لمحے وزیراعظم نے ہامی بھر لی تھی، لیکن بعد میں شاید وہ حفیظ جالندھری سے کی گئی بات بھول گئے۔ البتہ ترانے کا اشتہار ضرور شائع کیا گیا۔ اشتہار کی اشاعت کے بعد جب کسی شاعر نے ترانے کے متعلق رابطہ نہ کیا تو حفیظ جالندھری نے فنانس کمیٹی اے ڈی اظہر سے ملاقات کی اور انہیں کہا کہ ترانے کے لیے کوئی ایسی کمیٹی بنائی جائے جو بخوبی اس کام کو کر سکے۔ کمیٹی کے ممبران میں رفیق غزنوی، سرور نیازی، شاعر و نقاد ڈاکٹر تاثیر، ریڈیو کنٹرولر زیڈ اے بخاری، پروفیسر اورتی، ایس ایم اکرام، فنانس سیکرٹری اے ڈی اظہر اور حفیظ جالندھری بھی اس کمیٹی میں شامل تھے۔

اس کمیٹی کا پہلا اجلاس یکم مارچ 1949ء کو سردار عبدالرب نشتر کی رہائش گاہ پر ان کی صدارت میں ہوا۔ اجلاس میں اے ڈی اظہر کی اس تجویز پر سب متفق ہو گئے کہ علامہ اقبال کے کلام سے قومی ترانے کے لیے موزوں اشعار لیے جائیں اور دُوسرے اجلاس تک علامہ کے کلام کا انتخاب قومی ترانے کے طور پر چلایا جائے۔ چنانچہ ایسا کرنے کے باوجود کوئی شعر ترانے کے لیے موزوں نہ لگا۔

دُوسرے اجلاس میں یہ طے پایا کہ ترانے کی شاعری اور دھن بنانے کی تمام تر ذمہ داری حفیظ جالندھری کو دے دی جائے۔ اس فیصلے پر بہت سے لوگوں نے تنقید کی۔ حفیظ جالندھری نے لوگوں کی تنقید کی پروا کیے بغیر ملک وقوم کے لیے ترانہ لکھنے کی ہامی بھر لی اور ساتھ یہ بھی کہا کہ وہ انعام کی رقم سے ایک پائی بھی نہیں لیں گے۔

حفیظ جالندھری نے ترانے پر کام شروع کر دیا اور اس کے لیے انہیں چند آرکسٹرا والے دھن تیار کرنے کے لیے مل گئے۔ ترانے کی تیاری میں انہیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اکثر

آکسٹرا والے غائب ہوتے۔ اگر وہ آتے تو حفیظ جالندھری خود ڈیوٹی پر ہوتے۔ اُس وقت حفیظ جالندھری آرمی میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے اور بہت زیادہ مصروفیت کی وجہ سے ترانے پر زیادہ توجہ سے کام نہ کر سکے۔

جب 1950ء میں شاہ ایران پاکستان کا دورہ کرنے والے تھے تو ترانہ کمیٹی پر زور دیا گیا کہ وہ اپنے کام کو جلد مکمل کرے تا کہ شاہ ایران کا استقبال ترانہ بجا کر کیا جائے۔ چنانچہ کمیٹی نے کام تیز کر دیا اور اسی سال مارچ میں حکومت کو بہت سے ترانے اور دھنیں موصول ہوئیں۔ ان میں احمد جی چھاگلہ کی دھن کا انتخاب ہوا اور شاہ ایران کا استقبال بھی اسی دھن کو بجا کر کیا گیا۔

کمیٹی کے ایک اور اجلاس میں مزید ترانے اور دھنیں پیش ہوئیں۔ اس میں حفیظ جالندھری نے بھی اپنا ترانہ ''اے میرے وطن آزاد پاکستان'' پیش کیا، لیکن حفیظ جالندھری کے اس ترانے کے بول متاثر کن نہ تھے۔ چونکہ اسے دھن کے ساتھ پیش کیا گیا۔ اس لیے بہت سے لوگوں نے اِسے پسند کیا۔ بعض لوگوں نے اس پر تنقید کی اور کہا کہ ابھی دُوسرے شاعروں کو بھی مزید مواقع فراہم کرنے چاہئیں، لیکن ترانہ کمیٹی کے صدر سردار عبدالرب نشتر نے یہ کام آج ہی ختم کرنے کا حکم دیا اور شام تک اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ آئندہ اجلاس میں اب تک پیش کی گئی دھنوں اور شاعری کو دوبارہ سنا جائے اور پھر فیصلہ کیا جائے۔ اس اجلاس میں ریڈیو کنٹرولر زیڈ اے بخاری نے تجویز دی کہ جوش ملیح آبادی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور فیض احمد فیض سے بھی ترانے کے متعلق رابطہ کیا جائے۔ چنانچہ حفیظ جالندھری نے بہ خوشی اس بات کی اجازت دے دی کہ میرے علاوہ مزید شاعروں سے بھی رابطے رکھے جائیں۔

ایک روز کراچی میں حفیظ جالندھری سے موسیقار چھاگلا ملنے آئے۔ چھاگلا صاحب ایک بزرگ موسیقار تھے اور ان سے پہلے بھی متعدد بار حفیظ جالندھری کی ان سے ملاقات ہو چکی تھی۔ گفتگو کے دوران ترانے کی بات چلی تو حفیظ جالندھری نے چھاگلا کو ترانہ سنایا جسے چھاگلا صاحب نے پسند کیا۔ چند مختصر ملاقاتوں میں حفیظ جالندھری اور چھاگلا صاحب میں ترانے اور دھن کے متعلق بات چیت ہوئی۔ جس کے بعد حفیظ جالندھری کراچی سے راول پنڈی آ گئے۔

کافی دنوں کے بعد کرنل علوی کا حفیظ جالندھری کو فون آیا کہ آج کراچی میں ترانہ کمیٹی کا اجلاس ہونے والا ہے جس میں آپ کی شرکت بہت ضروری ہے۔

''میں اتنے قلیل وقت میں کیسے کراچی آ سکتا ہوں۔''

حفیظ جالندھری نے معذرت کرتے ہوئے جواب دیا۔ اُدھر کراچی میں تین بجے ترانہ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ صدارت پیرزادہ عبدالستار نے کی، کیوں کہ ترانہ کمیٹی کے سابق صدر سردار عبدالرب نشتر کو پنجاب کا گورنر بنا دیا گیا تھا۔

حفیظ جالندھری کی شرکت کے بغیر ہی اجلاس شروع ہوا۔ اجلاس میں شاعری کے بجائے موسیقی سن کر ترانے کی منظوری کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کی براہ راست اطلاع حفیظ جالندھری کو نہ دی گئی۔ چنانچہ 23 اگست 1949ء کو روزنامہ امروز میں ایک مختصر خبر نے حفیظ جالندھری کو چونکا دیا۔ خبر یہ تھی۔

''قومی ترانہ کمیٹی نے ریڈیو پاکستان اور مسٹر چھاگلا کی بنائی ہوئی دھن کو منظور کر لیا۔''

یہ خبر حفیظ جالندھری کے لیے مایوسی کا باعث بنی۔ مسٹر چھاگلا نے بھی انہیں اعتماد میں نہ لیا اور ترانہ کمیٹی نے بھی اُنہیں کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا۔ ترانے کے بول لکھنے سے پہلے دھن کی منظوری پر بہت سے لوگوں نے تنقید کی۔ چنانچہ اگلے اجلاس میں اس تنقید پر بحث ہوئی، لیکن صدر کمیٹی نے سب کے اعتراضات کو رد کرتے ہوئے فیصلہ دیا کہ دھن تیار کرنے کے بعد مشہور شاعروں سے ترانے لکھوا کر اگلے اجلاس میں پیش کیے جائیں اور فائنل ترانے کا انتخاب بھی اسی اجلاس میں ہوگا۔

چنانچہ اگلے اجلاس میں بہت سے شاعروں نے اپنے ترانے پیش کیے۔ ان شاعروں میں آرزو لکھنوی، حکیم احمد شجاع، زیڈ اے بخاری اور حفیظ جالندھری بھی شامل تھے۔ اس میں حفیظ جالندھری کے ترانے کو پسند کر کے حتمی شکل دے دی گئی۔ یوں 16 اگست 1954ء کو حفیظ جالندھری کے لکھے گئے ترانے کی منظوری کا سرکاری طور پر اعلان کر دیا گیا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ حفیظ جالندھری کا ترانہ 723 ترانوں میں سے منتخب ہوا۔ کابینہ نے حفیظ جالندھری کے ترانے کو منظور کیا اور اس طرح حفیظ جالندھری قومی ترانے کے خالق کہلائے۔

☆☆☆

داؤدی علمی آزمائش

دماغ لڑاؤ

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ قرآن مجید میں کُل کتنی آیات ہیں؟

i۔ 6662 آیات　ii۔ 6666 آیات　iii۔ 6664 آیات

2۔ حضور ﷺ کا حضرت عبداللہ بن حارثؓ سے کیا رشتہ تھا؟

i۔ خالہ زاد بھائی　ii۔ چچا زاد بھائی　iii۔ رضاعی بھائی

3۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا پیغمبری لقب کیا ہے؟

i۔ نجیب اللہ　ii۔ خلیل اللہ　iii۔ ذبیح اللہ

4۔ حضرت ثابت بن قیسؓ کس فن میں مہارت رکھتے تھے؟

i۔ خطابت　ii۔ شاعری　iii۔ فنِ کتابت

5۔ زکوٰۃ کس سنِ ہجری میں فرض ہوئی تھی؟

i۔ 9 ہجری　ii۔ 2 ہجری　iii۔ 4 ہجری

6۔ اونٹ کی اوسط عمر کتنی ہوتی ہے؟

i۔ 60 سال　ii۔ 70 سال　iii۔ 50 سال

7۔ نظم ''ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح'' کے شاعر کا نام بتائیے؟

i۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم　ii۔ میاں بشیر احمد　iii۔ حفیظ جالندھری

8۔ ''لائل پور'' پاکستان کے کس شہر کا پرانا نام ہے؟

i۔ لاہور　ii۔ ملتان　iii۔ فیصل آباد

9۔ پاکستان کے پہلے صدر کا نام بتائیے؟

i۔ لیاقت علی خان　ii۔ سکندر مرزا　iii۔ خواجہ ناظم الدین

10۔ پاکستان کا قومی ترانہ کس صنفِ شاعری میں لکھا گیا ہے؟

i۔ قصیدہ　ii۔ مثنوی　iii۔ مخمس

جوابات علمی آزمائش جولائی 2012ء

1۔ سورۃ البقرہ 2۔ حضرت ابراہیمؑ 3۔ صفی اللہ 4۔ عمیر 5۔ نمازِ جمعۃ المبارک 6۔ سموئیل ہنمین 7۔ روس 8۔ جابر بن حیان 9۔ قائداعظم 10۔ صدیق سالک

اِس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ سیدہ میمونہ کنول، واہ کینٹ　(200 روپے کی کتب)

☆ محمد عدنان انجم، خانیوال　(175 روپے کی کتب)

☆ ثقلین اختر، اوکاڑہ　(125 روپے کی کتب)
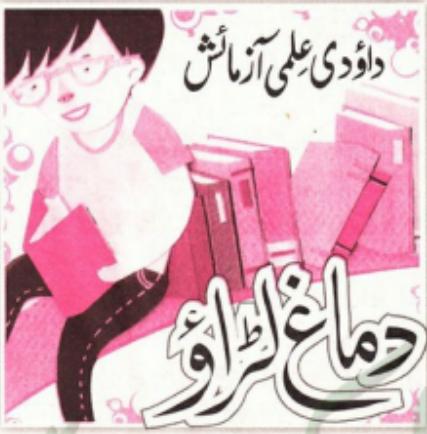
دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

☆☆ قمر ناز دہلوی، زوبیہ رضی، کراچی۔ محمد ابراہیم، خنساء اشرف، عائشہ ضیف، محمد عاصم رضا، ماریہ جاوید چودھری، محمد خبیب فرحان، منیبہ عدنان، محمد نعیم امین، سیدہ ماہ نور، عفران شاہ، احمد فاروق، حمنہ عارف، معید رحمٰن، حادیہ خالد، جویرہ ذوالفقار، تحریم خالد، محمد عبداللہ، محمد عدیل طاہری، سید محمد عادل ہاشمی، لاہور۔ صدف نیاز، راول پنڈی۔ ثمین رابعہ، گوجرانوالہ۔ نیہا فاطمہ، پتوکی۔ سماوی ناصر، ملتان۔ عون عثمان، شیخوپورہ۔ شہانہ نیاز، فیصل آباد۔ ایمان فاطمہ، راول پنڈی۔ نیلوفر جاوید، ڈیرہ غازی خان، ثمرین عبدالصمد، مہرین عبدالصمد، رحیم یار خان۔ محمد ابوبکر صدیق، ٹیکسلا۔ شہیر حسن، خوشاب۔ محمد معید حیدر، راول پنڈی۔ فائزہ فیاض، وجیہہ سرفراز علوی، بہاول نگر۔ محمد فیضان، محمد عبداللہ مسعود، اسلام آباد۔ بسمہٗ اعظم، راول پنڈی۔ جنید نعیم دیوان، حویلی لکھا۔ حافظ عبدالمتین چغتائی، محمد ذیشان شیرازی، محمد شہروز علی، ملتان۔ سویرا ادریس احمد، پشاور۔ نادیہ طارق، کوٹری۔ مرزا فرحال بیگ، حیدرآباد۔ عروج فاطمہ، راول پنڈی۔ علی رضا چاند، بھابڑہ۔ کامران زیب مروت، پشاور۔ عمیر احمد، معاذ احمد، ڈیرہ غازی خان۔ سدرہ ظفر بٹ، لالہ موسیٰ۔ اسامہ بن وحید، اسلام آباد۔ علی معاذ، فیصل آباد۔ طلال ساہی، اقراء ساہی، جہلم۔ عبدالسمیع، فیصل آباد۔ محمد بن طارق، رحیم یار خان۔ عبداللہ بن ثقلین، بہاول پور۔ محمد ابراہیم خان، اویس شوکت، فیصل آباد۔ شایان اقدس، جہلم۔ کومل صادق چودھری، گوجرانوالہ۔ ردا نوید، اسلام آباد۔ محمد عثمان، اٹک۔ ذوالقرنین، چکوال۔ محمد انس بیگ، گجرات۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 اگست 2012ء ہے۔

دماغ لڑاؤ

نام:

مقام:

پتا:

بھولا زندہ باد

(عروہ اکرم، گجرات)

''گھر جاتے ہوئے کچھ پھل لے لیتے ہیں۔'' کانسٹیبل نوید نے اپنے ساتھی کانسٹیبل حمید کو مخاطب کیا۔

کچھ دیر بعد وہ ایک ریڑھی والے سے آم خرید رہے تھے

کہ ایک لڑکا اُن کی طرف بڑھا۔ وہ حمید کو دیکھ کر ہنستے ہوئے تالیاں بجانے لگا۔

''میرے حمید انکل آئے، میرے حمید انکل آئے۔''

''بھولے کیسے ہو؟'' حمید نے بھولے سے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں، کیا آپ میرے لیے چاکلیٹ لائے ہیں؟'' بھولے نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے پیارے بھولے کے چاکلیٹ نہ لائیں، یہ لو اپنی چاکلیٹ۔''

''شکریہ انکل، میرے انکل زندہ باد، میرے انکل بہت اچھے ہیں۔'' بھولا یہ کہتے ہوئے دائیں گلی کی طرف بڑھ گیا۔

''یہ لڑکا کون ہے؟'' نوید نے سوال کیا۔

''یہ بلال عرف بھولا ہے، اس کے والدین دو سال قبل مین بازار میں ہونے والے بم دھماکے میں شہید ہو گئے تھے۔ یہ ہماری گلی میں اپنی خالہ کے ہاں رہتا ہے، میں جب بھی گھر آتا ہوں تو اس کے لیے چاکلیٹ لے کر ضرور آتا ہوں، بھولے کو چاکلیٹ کا شدت سے انتظار ہوتا ہے۔'' حمید نے جواب دیا۔

اگست کا مہینہ شروع ہوا تو بھولا پاکستان کا جھنڈا لے کر گلی میں گھومنے لگا۔ وہ گلی میں جھنڈا لہراتا جاتا اور پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگاتا جاتا۔ ایک دن سراج الدین نے اُس سے پوچھا۔

''14 اگست کو کیا ہوا تھا؟''

بھولا یہ سن کر کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

''آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں ہے کہ 14 اگست کو کیا ہوا تھا، مجھے معلوم ہے کہ 14 اگست 1947ء کو ہمارا پیارا پاکستان بنا تھا، مجھے تو یہ بھی پتہ ہے کہ اس کو قائداعظم نے بنایا ہے۔ میں بھولا ضرور ہوں، مگر ان ساری باتوں کو جانتا ہوں۔'' سراج الدین کے مزید کچھ پوچھنے سے پہلے بھولا پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

13 اگست کی رات بھولا کسی کام سے گھر سے باہر آیا تو کالونی کے آخر میں واقع ایک سکول کی بیرونی دیوار کے ساتھ اُسے کچھ لوگ کھڑے دکھائی دیئے۔ بھولا انہیں دیکھ کر فوراً ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ اب وہ ان کی باتیں آسانی سے سن سکتا تھا۔

''یہی وہ سکول ہے جہاں ایکشن کرنا ہے۔'' گنجے سر والے آدمی نے کہا۔

''سکول کا چوکی دار اس وقت کہاں ہوگا؟'' گھنی مونچھوں والا آدمی بولا۔

''سکول کا چوکی دار اپنے کوارٹر میں ہو گا، راستہ صاف ہے، ہم دیوار پھلانگ کر اندر جائیں گے اور اس کمرے میں جہاں کل آزادی کی تقریب ہو گی وہاں بم نصب کرنا ہے، آ جاؤ، دیر مت کرو۔'' گنجے سر والا آدمی بولا۔

پھر دونوں دیوار پھلانگ کر سکول میں داخل ہو گئے۔ بھولا ساری بات سمجھ گیا تھا۔ وہ بھاگم بھاگ انکل حمید کے گھر کی طرف دوڑا اور انہیں جا کر ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ انکل حمید نے فوراً اس کی اطلاع تھانے میں کی۔ کچھ ہی دیر میں سکول کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ دونوں دہشت گرد سکول ہی میں تھے۔ پولیس نے دونوں کو گرفتار کر لیا۔ دہشت گردوں کو گرفتار دیکھ کر بھولا خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ہمارے انکل حمید زندہ باد، ہمارے انکل زندہ باد۔''

''زندہ باد میں نہیں، زندہ باد تو بھولا ہے، بھولے تمہاری بروقت اطلاع کے باعث یہ دہشت گرد گرفتار ہو سکے ہیں، بھولا زندہ باد۔''

14 اگست کی صبح جب آزادی کی تقریب کا آغاز ہوا تو سبھی لوگوں نے دیکھا کہ تقریب کے مہمان خصوصی کے طور پر بھولے کو بلایا گیا تھا۔ بھولا بہت خوش تھا۔ اس کی وجہ سے دہشت گرد گرفتار ہوئے تھے اور بہت سی قیمتی جانیں بچ گئی تھیں۔ اس موقع پر ایک مخیّر شخص نے بھولے کے علاج اور اس کے تمام تعلیمی اخراجات برداشت کرنے کا وعدہ کیا۔ جب سکول کے طلبہ نے پاکستان کا قومی ترانہ پڑھا تو بھولا بھی ان میں شامل تھا۔

(پہلا انعام: 200 روپے کی کتب)

پہلا قدم

(روبینہ ناز، کراچی)

عاشر نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ خاص طور پر نعت اور تقریری مقابلے میں وہ کئی بار انعام حاصل کر چکا تھا۔ اس کے کمرے میں کئی شیلڈز اور ٹرافیاں الماری میں سجی تھیں۔ جو اس کی قابلیت کا ثبوت تھیں۔ اس کے علاوہ عاشر کو شہر میں ہونے والی تقریبات میں بھی شرکت کرنے کا شوق تھا۔ عاشر کے والد زمان شہر کی مشہور سماجی شخصیت تھے۔ وہ آئے روز شہر میں ہونے والی تقریبات میں شریک ہوتے۔ آج بھی اس کے والد کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ عاشر نے ان سے پوچھا۔

''ابو آپ کہاں جانے کی تیاری کر رہے ہیں؟''

''آج شہر کے معروف ہوٹل میں ایک پروگرام ہے وہیں جا رہا ہوں۔'' ابو نے جواب دیا۔

''ابو کیا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟'' عاشر نے کہا۔

''ہاں، کیوں نہیں، ضرور چلو۔''

''ابو! آج سیمینار کا موضوع کیا ہے؟'' عاشر نے سوال کیا۔

''آلودگی اور ہم۔'' ابو نے جواب دیا۔

کچھ دیر کے بعد وہ ہوٹل پہنچ گئے۔ پروگرام کا آغاز تلاوتِ قرآن سے ہوا۔ اس کے بعد نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پیش کی گئی۔ پھر شرکاء نے آلودگی کے موضوع پر تقاریر کیں۔ انہوں نے بتایا کہ کس طرح ہم اپنے ماحول کو صاف ستھرا رکھ کر صحت مند رہ سکتے ہیں کیوں کہ صحت مند جسم میں ہی صحت مند دماغ ہوتا ہے۔

آخر میں زمان صاحب کو تقریر کے لیے بلایا گیا۔ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''آج ہم سب یہاں آلودگی کے موضوع پر بات چیت کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ یہ ہمارا نہیں پوری دُنیا کا مسئلہ ہے۔ یہ آلودگی اگر پھیل رہی ہے تو ایسا ہماری وجہ سے ہو رہا ہے، ہم ماحول کو آلودہ کرتے ہیں۔ شہر میں جگہ جگہ کچرے کے ڈھیر ہیں اس کے علاوہ گاڑیوں سے نکلنے والا دھواں فضا کو آلودہ کر رہا ہے۔ اگر ساحلِ سمندر کا رخ کریں تو وہاں آنے والے لوگ بچا ہوا کھانا

یا خالی تھیلیاں پانی میں بہا دیتے ہیں۔ ماحول کو صاف رکھنا ہم سب کا فرض ہے۔ ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لیے پہلا قدم ہم خود اٹھائیں اور اپنے گھر کو صاف رکھیں۔ اس کے علاوہ گھروں میں پودے لگائیں تاکہ ماحول آلودہ نہ ہو۔ بچوں کو سکول اور گھر میں یہ تربیت دی جائے کہ وہ ٹافی اور چپس کھا کر ان کے ریپر اِدھر اُدھر نہ پھینکیں۔ بڑوں کو چاہیے کہ وہ بچوں کے لیے عملی نمونہ بنیں کیوں کہ بچے وہی کرتے ہیں جو بزرگوں کو کرتا دیکھتے ہیں۔

عاشر اپنے ابو کی باتیں غور سے سن رہا تھا گھر آ کر اس نے پروگرام کی تفصیل اپنی امی اور دُوسرے دن سکول میں جا کر اپنے دوستوں کو بتائی۔ اُس نے اپنے دوستوں سے وعدہ لیا کہ ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لیے وہ اپنا اپنا کردار ادا کریں گے۔

اتوار کے دن رات کو کھانا کھانے کے بعد عاشر کے ابو جان ٹی وی دیکھنے لگے۔ عاشر ان کے پاس بیٹھ کر سکول کا کام کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد عاشر کے ابو نے اُسے آواز دی۔ وہ اٹھ کر ان کے پاس گیا تو انہوں نے عاشر کو ایک کاغذ دیا اور کہا:

''عاشر! یہ کاغذ کھڑکی سے باہر پھینک دو۔''

ابو کی بات سن کر عاشر حیرت سے انہیں دیکھ کر بولا۔

''ابو! آپ نے تو اس دن تقریر میں کہا تھا کہ ماحول کو صاف رکھنا ہم سب کا فرض ہے اور آلودگی دُور کرنے کے لیے پہلا قدم ہمیں خود اٹھانا چاہیے۔ مزید یہ کہ بچے وہی کرتے ہیں جو بڑوں کو کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، کل ہی میں نے سکول میں اپنے دوستوں سے وعدہ لیا تھا کہ وہ آلودگی ختم کرنے میں اپنا کردار ادا کریں گے اور اس کی ابتداء اپنے گھر سے کریں۔ اگر آپ خود ہی ایسا کریں تو پھر میں......''

عاشر کی باتیں سن کر ابو جان نے اُسے گلے لگا لیا۔ اچھا کام کرنے کے لیے انسان کو پہلا قدم خود اٹھانا چاہیے۔ اسی طرح لوگ ملتے ہیں اور کارواں بنتا چلا جاتا ہے۔ اچھے کام کی ابتداء اپنی ذات سے ہوتی ہے۔ کیوں ساتھیو کیا خیال ہے آپ کا؟

(دُوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

انعام

(شاہ بہرام انصاری، لاہور)

چودہ اگست کی آمد آمد تھی۔ احمد کو شدت سے اس بات کا انتظار تھا کہ اس کے ابو جان اُس کے لیے ایک بڑا سا سبز ہلالی پرچم لائیں گے۔ جب ایسا نہ ہوا تو ایک دن اُس نے ابو جان سے پوچھ ہی لیا۔

''ابو! آپ جھنڈا کب لے کر آئیں گے، محلے میں میرے دوستوں نے جھنڈے خرید بھی لیے ہیں۔''

''جب دفتر سے تنخواہ ملے گی تو میں اُس دن گھر آتے ہوئے

جھنڈا لے آؤں گا'' ابو جان نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو کب دفتر سے تنخواہ ملے گی؟'' احمد نے سوال کیا۔

''بہت جلد، اچھا اب سو جاؤ'' ابو جان کے کہنے پر احمد نے آنکھیں بند کر لیں۔

ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا مگر ابو جان کو ابھی تک تنخواہ نہیں ملی تھی۔ اتوار کو ملتان سے چچا جان آئے تو انہوں نے احمد کو پچاس روپے دیئے تھے۔ پچاس روپے پا کر وہ بہت خوش تھا۔ اب وہ آسانی سے جھنڈا خرید سکتا تھا۔ شام کے وقت وہ پچاس روپے جیب میں رکھے بازار چلا گیا۔ وہاں دُکان پر سبز ہلالی پرچم اور

خوب صورت جھنڈیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ ایک دُکان کے سامنے کھڑا تھا کہ ایک لڑکے نے اُسے مخاطب کیا۔

''میں صبح سے بھوکا ہوں میری مدد کریں، میں آپ کو دُعائیں دوں گا۔''

''تم کہاں رہتے ہو؟'' احمد نے پوچھا۔

''ریلوے لائن کے ساتھ کچی آبادی میں ہمارا گھر ہے، میرے والد پچھلے سال ایک حادثے کا شکار ہو کر انتقال کر گئے تھے، والدہ بیمار ہیں وہ کوئی کام نہیں کرسکتیں، میں صبح سے کام کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں مگر مجھے کوئی کام نہیں ملا۔'' یہ کہتے ہوئے لڑکا زاروقطار رونے لگا۔ احمد کو اس پر ترس آ گیا۔ اُس نے ایک نظر لہراتے ہوئے پرچموں کو دیکھا اور پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر پچاس روپے نکالے اور اُس لڑکے کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا:

''یہ لو اس سے کھانے پینے کے لیے کچھ لے لینا۔'' پچاس روپے دیکھ کر اُس لڑکے کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ احمد جب خالی ہاتھ گھر پہنچا تو ابو جان اس کے منتظر تھے۔ ابو جان کے پوچھنے پر احمد نے ساری بات بتائی تو انہوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

''احمد! تم نے بہت اچھا کام کیا ہے، کسی ضرورت مند کی مدد کرنا بہت اچھی بات ہے، دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔''

یہ کہہ کر ابو جان کمرے سے پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لائے تو احمد اُسے دیکھ کر خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔

''ابو جان! وہ تنخواہ۔'' احمد اتنا ہی کہہ سکا۔

''مجھے آج ہی تنخواہ ملی ہے، اسی لیے تو تمہارے لیے پیارا سا پاکستان کا جھنڈا لایا ہوں۔'' ابو جان بولے۔

پیارے وطن کا پیارا جھنڈا پا کر احمد کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے ایک غریب لڑکے کی مدد کرنے کا اُسے انعام دیا ہو۔

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

محنت میں عظمت

(صفیہ زینب، تربیلا)

ایک شخص کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اپنی غربت اور پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے اُس نے کہا: ''میں غربت سے تنگ آ گیا ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ اب میں مر جانا چاہتا ہوں۔'' بزرگ نے ایک نظر اس شخص کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا: ''تمہارے چہرے پر دو آنکھیں ہیں، تم چاہو تو ان کے بدلے میں تمہیں دس ہزار درہم مل سکتے ہیں، کیا تم انہیں بیچنے کے لیے تیار ہو؟'' اُس شخص نے انکار کر دیا۔

بزرگ نے کہا: ''اچھا کیا تم اس بات کی اجازت دیتے ہو کہ دس ہزار کے بدلے میں تمہاری زبان نکال لی جائے۔'' اُس شخص نے اب بھی انکار کیا۔

بزرگ کچھ دیر سوچتے رہے پھر کہنے لگے:

''تمہاری غربت دُور کرنے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ اگر تمہارے چاروں ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں اور تمہیں اکٹھے بیس ہزار درہم دیے جائیں تو یقیناً تم مالا مال ہو جاؤ گے، بولو کیا تمہیں منظور ہے؟'' ''نہیں نہیں۔'' وہ شخص چیخ اٹھا۔ ''میں اپنا کوئی عضو جسم سے جدا نہیں کر سکتا۔'' بزرگ مسکرائے اور پھر فرمایا: ''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے اعضاء کے باعث لاکھوں درہموں کے مالک ہو، اس کے باوجود غربت کا شکوہ کیوں؟'' وہ شخص حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔ بزرگ نے پھر کہا: ''تم بہت کچھ حاصل کر سکتے ہو۔ جدوجہد کرو، محنت کرو اور شکر کرو کہ انمول آنکھیں رکھتے ہو۔ بیش بہا زبان کے مالک ہو، وہ ہاتھ پاؤں رکھتے ہو جن کی کوئی قیمت ادا نہیں کی جا سکتی، اس کے ساتھ عقل و شعور بھی رکھتے پھر بھی اپنے آپ کو غریب سمجھتے ہو۔ جاؤ میرے بھائی، تم کبھی مفلس نہیں تھے، نہ ہو گے اور نہ کبھی مفلس رہو گے۔''

وہ شخص نادم ہوا اور اُس نے عہد کیا کہ وہ آئندہ محنت کرے گا کیوں کہ محنت ہی میں عظمت ہے اور بغیر محنت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

(اعزازی تحریر)

اے وطن پیارے وطن

جدون ادیب

حماد میٹرک کر چکا تھا اور اب اپنی چھٹیوں کو کارگر بنانے کے لیے سوشل ورک کر رہا تھا۔ وہ چند لڑکے جمع کر کے کونسلر کے پاس گیا اور شکایت لگائی کہ علاقے کے گراؤنڈ میں لگنے والے منگل بازار سے بچوں کو تکلیف ہو رہی ہے۔ کیوں کہ سبزیاں اور پھل بیچنے والے گلے سڑے مال کو گراؤنڈ میں پھینک جاتے تھے جو جمعرات کی ہفتہ وار صفائی تک وہیں پڑا رہتا تھا۔

کونسلر بہت دن سے فارغ تھا۔ کمائی کا ہر ذریعہ وہ آزما چکا تھا۔ اسے یہ سنہری موقع ملا تو وہ متحرک ہو گیا۔ اُس نے بازار کمیٹی کو شکایت سے آگاہ کیا اور شکایت کے ازالے کا حل پیش کیا اور سودا ہو گیا۔ حماد اور اس کے دوستوں کو مسئلے کے حل سے دل چسپی تھی، طریقہ کار سے نہیں۔

اس کامیابی سے حماد کے حوصلے بلند ہوئے۔ یاسر اس کا بہت قریبی دوست تھا۔ دونوں کے بیچ چھوٹی سی بات پر اختلاف ہوا تو یاسر نے حماد کو طعنہ دیا کہ محلے کا ایک چھوٹا سا مسئلہ حل کروا کر وہ خود کو بڑا آدمی سمجھ رہا ہے۔ وہ محلے سے باہر کچھ کر کے دکھائے۔

حماد کا ذہن تھوڑا سیاسی ہو گیا تھا۔ اسے جو پذیرائی ملی تھی اس نے اُسے بہت لطف دیا تھا۔ نمایاں اور اہم ہونے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ حماد نے سوچا کہ قریبی بازار سے اپنی خدمات کا آغاز کرنا چاہیے۔

یاسر کی جگہ بادل نے لے لی تھی۔ دونوں نے بازار کا چکر لگایا اور بہت غور فکر کیا کہ کیا کریں مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

دُوسرے دن جب شام کا وقت تھا تو دونوں نے دیکھا کہ بازار کے چوک میں ایک غنڈہ ٹائپ آدمی ایک پھول بیچنے والے لڑکے کو ڈانٹ کر بھگا رہا تھا۔ لڑکا منت سماجت کر رہا تھا۔ مگر غنڈے نے اُسے دھکا دے کر گرایا اور پھر اُسے بازو سے پکڑ کر پیچھے کو دھکیلا۔

حماد نے بادل کی طرف دیکھا۔ بادل نے نفی میں سر ہلایا: ''نہیں گرو! غنڈے کے بازو کی مچھلیاں دیکھو اور اپنے اور میرے یہ سوکھے سوکھے بازوؤں پر رحم کرو!''

حماد مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا: ''وہ ایک ہے اور ہم دو!''

''اور وہ تین ہیں!'' بادل نے اشارہ کیا۔ دو اور آوارہ قسم کے لوگ اس غنڈے کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور سگریٹ پیتے ہوئے ہنسی مذاق کرنے لگے۔

حماد مایوس ہو گیا پھر کچھ سوچ کر بولا: ''لگتا ہے یہ اس بازار کے بھتہ مافیا کے لوگ ہیں۔ ان سے ذرا مختلف انداز میں نمٹنا ہوگا!''

''گرو......!'' بادل حیرت سے بولا: ''تم واقعی کچھ کرنا چاہتے ہو؟''

''بالکل'' حماد مسکرا کر بولا: ''میرے ذہن میں بہت ساری باتیں آ رہی ہیں۔ چلو فی الحال ذرا اس پھول بیچنے والے لڑکے کی دادرسی کرتے ہیں۔ اس سے پھول خریدتے ہیں۔''

''چلو'' بادل نے کہا۔ پھر دونوں لڑکے کے پیچھے دوڑے، مگر

وہ لڑکا بھیڑ میں کھو گیا۔ دونوں واپس لوٹ آئے۔

اگلے دن حماد نے کونسلر اور علاقے کے سینئر سماجی کارکن حاجی چچا سے ملاقات کی اور بازار سے متعلق معلومات چاہیں۔ انہوں نے دونوں کو سمجھایا کہ یہ بازار کی یونین کے آدمی ہیں اور دُکان داروں کے کہنے پر وہ ہر اُس شخص کو دُکان کے آگے سے ہٹاتے ہیں جو وہاں اپنا سامان بیچ رہا ہوتا ہے۔ حماد مایوس ہو گیا تھا۔

اگست کے پہلے ہفتے میں دادا جان کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ جشنِ آزادی کی تیاریاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ دادا ابو دو دن ہسپتال میں داخل رہے پھر وہ گھر آئے تو حماد، فواد، جواد اور آسیہ کو افسردہ پایا۔ انہیں قلق تھا کہ وہ اس بار دھوم دھڑکے سے جشنِ آزادی نہیں منا سکیں گے۔

دادا جان نے یہ دیکھ کر کہ ان کی وجہ سے ان کے پوتے اور پوتی خوشی نہیں منا رہے تو وہ ان کے ساتھ خود تیاریوں میں لگ گئے۔ ذرا سی دیر میں ماحول بدل گیا۔ آسیہ نے شازیہ اور فرزانہ کو بھی بلا لیا۔ جواد نے نقاش کو فون کر دیا۔ شام تک پورا گھر دادا جان کے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں سے بھر گیا۔

وہ بچوں کو گھر سجاتا دیکھ کر بہت مسرور اور خیالوں میں گم تھے۔ انہیں پاکستان کی آزادی کا دن یاد آیا تھا جب وہ خود سولہ سال کے نوجوان تھے اور آزادی کی تحریک میں بہت پُرجوش انداز میں شریک تھے۔

بچوں کو پتا تھا کہ دادا ابو آزادی کی کہانی ضرور سنائیں گے جو بہت مزے دار ہو گی۔ بڑی امی نے سب کو لان میں چائے پینے کے لیے بلایا تو وقاص نے موقع دیکھ کر آزادی کی بات چھیڑ دی۔ دادا ابو خیالوں میں کھو گئے اور پھر آہستہ آہستہ قائداعظم کی تعریف سے آزادی کی کہانی شروع کی۔ دادا ابو کے ہیرو بہت تھے۔ قائداعظم، علامہ اقبال، سر سید احمد خان، مولانا محمد علی جوہر، نواب محسن الملک، وقار الملک، مولانا ظفر علی خان۔

وہ ہمیشہ بتاتے تھے کہ سر سید احمد خاں ہندوستان کے مسلمانوں کے پہلے دُور اندیش رہبر تھے۔ دراصل پاکستان کی پہلی اینٹ رکھنے والے وہی تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کی ہمت و جرأت اور بلند حوصلے کی تعریف کرنا وہ کبھی نہیں بھولتے تھے۔ علامہ اقبال کے تدبر اور فراست اور قائداعظم کی بے نظیر سیاسی جدوجہد کو ہر بار اس طرح بیان کرتے کہ ہر بار نیا لطف آتا۔

دادا ابو کی پُرلطف باتوں کا سلسلہ دراز ہو گیا تھا، مگر پھر کھانے کی آواز لگ گئی اور بات ادھوری رہ گئی۔ پھر جب یہ لوگ اپنے کمروں میں جمع ہوئے تو اس موضوع پر بات کرنے لگے۔

حماد مکا لہرا کر بولا: ''دیکھا، مسلمانوں کے اتحاد نے کیا کرشمہ کر دکھایا، اتحاد میں بڑی قوت ہے، ہمیں اس قوت کو استعمال کرنا چاہیے!''

''وہ کیسے؟'' شازیہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

''وہ خواتین کے جانے کے بعد بتایا جائے گا!'' وقاص نے کہا اور ساری لڑکیاں منہ چڑا کر باہر چلی گئیں۔

حماد کا پلان سیدھا سادہ تھا۔ دُوسرے دن اُس نے پھول بیچنے والے لڑکے سے ملاقات کی۔ وہ بس اسٹاپ پر پھول بیچ رہا تھا۔ حماد چونکہ لڑکے کی مدد کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ بھی راضی ہو گیا۔

شام کو لڑکا اچانک مرکزی چوک میں آ کر کھڑا ہو گیا اور پھول اور ہار بیچنے لگا تو کچھ دیر کے بعد وہی غنڈہ ٹائپ آدمی پھول بیچنے والے لڑکے کے قریب آ کر اُسے غصے سے گھورنے لگا۔ حماد نے اشارہ کیا۔ چار لڑکے آگے بڑھے اور پھول بیچنے والے لڑکے کے گرد جا کر کھڑے ہو گئے۔ دو اور بدمعاش آ کر وہاں کھڑے ہو گئے۔ لوگ پیچھے ہٹنے لگے۔ حماد نے اپنے دُوسرے دوستوں کو اشارہ کیا اور دُوسرے لمحے انہوں نے ایک گھیرا ڈال دیا اور ہاتھ پکڑ کر دائرہ بنا لیا۔ ابھی تک کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ لوگ اس جھگڑے کو دیکھنے کے لیے جمع ہونے لگے۔

''کیا چاہتے ہو تم لوگ! جونی دادا کے کام میں رکاوٹ ڈالتے ہو!'' ایک غنڈے نے اپنا تعارف کرایا۔

حماد آگے بڑھ کر بولا: ''جونی دادا! بات صرف اتنی سی ہے کہ یہ سڑک کسی نے خرید نہیں رکھی۔ یہ لڑکا اس سڑک پر کھڑا ہو کر پھول بیچے گا اور اسے کوئی منع نہیں کرے گا۔''

وقاص حماد کو پیچھے ہٹا کر بولا: ''لوگ نہ جانے کیا کیا بیچ دیتے ہیں۔ اپنا وقار، اپنا ایمان، اپنے ملک کی سلامتی اور یہ بے چارہ پھول بھی نہ بیچ پائے! یہ ہم نہیں ہونے دیں گے دادا بھائی!''

دُوسرے دن اس لڑکے نے وہیں کھڑے ہو کر پھول بیچے اور کسی نے اسے تنگ نہیں کیا مگر تیسرے دن وہ دوبارہ بس اسٹاپ پر چلا گیا اور حماد کے استفسار پر بتایا کہ بے شک اسے کوئی تنگ نہیں کرتا مگر اسے وہاں بے فکری اور اطمینان میسر نہیں۔ کچھ لوگ اُسے گھورتے ہیں تو وہ گھبرا جاتا ہے۔

حماد نے اپنے کزنز اور دوستوں کو بلا کر اس معاملے کے بارے میں مشورہ مانگا۔ کئی ایک نے تو غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس معاملے میں پڑنے کی ضرورت کیا تھی۔ کسی نے کہا کہ ایک آدمی کو حق دلا کر کیا انقلاب آ جائے گا۔

وقاص نے حماد کی حمایت کی اور کہا کہ حماد سچائی کے لیے لڑا رہا ہے اور سب کو اس کا ساتھ دینا چاہیے۔

اس وقت فواد اور دادا ابو باتیں کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور سب انہیں دیکھ کر خوش ہو گئے۔ دادا ابو کی جہاں دیدہ نظروں نے بھانپ لیا کہ بچوں کو کوئی اہم مسئلہ درپیش ہے، انہوں نے سارا معاملہ اگلوا لیا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد نتیجہ اخذ کرنے والے انداز میں بولے:

''میرے بچو! بات پھر اپنی ذات سے شروع ہو گی اور پاکستان پر آ کر ختم ہو گی! تم بور تو نہیں ہو جاؤ گے۔''

''نہیں، نہیں! دادا ابو!'' سب تڑپ گئے۔

دادا ابو بولے: ''بچو! تم نے جو کچھ کیا وہ حوصلے اور ہمت کی بات ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ حوصلے اور ہمت کو درست سمت میں لگانا چاہیے۔ بدقسمتی سے ہم بہ حیثیت پاکستانی قوم بہت جذباتی ہیں اور کسی بھی معاملے کے آخری حل کو پہلے حل کے طور پر آزماتے ہیں۔ جوش میں ہوش کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں۔ اپنی توانائیاں درست سمت میں نہیں لگاتے۔ اس معاملے کے حل کا طریقہ یہ ہے کہ بازار کی یونین والوں سے بزرگوں کی سربراہی میں مل کر باہم اتفاق سے اس پھول بیچنے والے بچے کی مدد کی جائے، ضرورت پڑنے پر قانونی مدد کے لیے درخواست متعلقہ محکمے کو لکھی جائے، جس پر کئی افراد کے دستخط ہوں تاکہ یہ اجتماعی مسئلہ ظاہر ہو۔ تعلیم یافتہ افراد کا دُوسروں کی مدد کرنے کا طریقہ کار مہذب ہونا چاہیے۔ قلم میں جو طاقت ہے یعنی قانونی کاغذی کارروائی میں جو کام ہو سکتا وہ طاقت کے استعمال سے ممکن نہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ دُوسروں کی مدد مت کرو، مگر طریقہ کار ٹھیک کرو۔''

حماد سمیت سبھی کی آنکھیں کھل گئیں۔ حماد نے سوچا کہ وہ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے قلم کے ذریعے دُوسروں کی مہذب طریقے سے مدد کا سلسلہ جاری رکھے گا۔

14 اگست کی روشن اور چمک دار صبح طلوع ہوئی تو ہر طرف خوشیاں رقص کرتی نظر آئیں۔ حماد اصرار کر کے دادا ابو کو بازار لے گیا۔ پھول بیچنے والا لڑکا آج 14 اگست کے بیج اور اسٹیکر بیچ رہا تھا اور اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ دادا جان مسکرائے اور نظر بھر کر دُور تک دیکھتے ہوئے بولے:

''جو قوم اپنی آزادی کا جشن شایانِ شان طریقے سے مناتی ہے، اُسے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ جشنِ آزادی کا دن قوم کے اتحاد کا مظہر ہے، محبت، بھائی چارے اور اتفاق کا اظہار ہے۔''

''آپ درست فرماتے ہیں دادا ابو!'' حماد نے اثبات میں سر ہلایا۔

دادا ابو نے دُور تک لہراتے جھنڈوں، سجے ہوئے بازار، لوگوں کے سینوں پر لگے بیج اور اسٹیکروں کو دیکھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے جھنڈیاں لیے اِدھر سے اُدھر جا رہے تھے۔ کئی گھروں میں اب بھی سجاوٹ کا کام ہو رہا تھا۔

دادا ابو کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ انہوں نے حماد کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے:

''اس قوم کے بچوں اور نئی نسل نے مجھ جیسے بوڑھوں کو عمر کے اس حصے میں جو اطمینان بخشا ہے، وہ ان کا احسان ہے۔ تم بچے ہی اس ملک کو مسائل سے نکالو گے! پاکستان زندہ رہے تاقیامت! کیوں کہ اس کے محافظ پاکستانی بچے، طالب علم اور مزدور ہیں!''

''ان شاء اللہ دادا ابو!'' حماد کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی۔

دُور کہیں ایک خوب صورت ملی نغمہ سنائی دے رہا تھا۔

اے وطن پیارے وطن

پاک وطن پاک وطن...... اے میرے پیارے وطن

ا	ک	ت	و	ب	ر	ق	ف	ج	ر
ط	چ	ر	ا	م	ظ	س	ر	و	ب
چ	ب	س	ج	ن	ت	غ	و	ل	م
گ	ل	ا	پ	ر	ی	ل	ر	ا	س
ف	ر	ب	م	و	ن	ع	ی	ء	د
ل	س	د	ن	چ	ی	ت	د	ی	ر
خ	ت	ن	ط	ع	ر	ج	و	ن	ب
ا	گ	س	ت	ف	و	م	خ	ا	م
ی	م	ل	و	ب	ن	ر	ظ	ش	ت
ک	ب	ی	ء	م	ج	غ	آ	ص	س

آپ نے حروف ملا کر عیسوی سال کے بارہ مہینوں کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان مہینوں کے ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن مہینوں کے ناموں کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں۔

جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

جولائی کے شمارے کا سرورق دیکھتے ہی دل باغ باغ ہو گیا۔ تمام تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ فیروزسنز کے شوروم کو آگ لگنے کی خبر پڑھی تو دل اُداس ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ جلد از جلد شوروم کی بحالی ہو جائے اور علم و آگاہی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو سکے۔ (شمریز الرحمٰن، بہاول پور)

☆ آپ کی دُعا سے شوروم کی بحالی کا عمل شروع ہو چکا ہے۔

مجھے جنون کی حد تک ''تعلیم و تربیت'' پڑھنے اور اس کی باتوں پر عمل کرنے کا شوق ہے۔ (ذیشان احمد صدیقی، میاں والی)

جولائی کا شمارہ زبردست رہا۔ کہانیوں میں سر جھک گیا، پانچ ہزار کا نوٹ، مبارک سلسلہ اور چچا تیزگام کی افطار پارٹی ٹاپ پر رہیں۔ انوکھی دُنیا دل چسپ ناول ہے۔ نظم پھلوں کا بادشاہ کون؟ بہت پسند آئی۔ (تنویر احمد، لاہور)

فیروزسنز کے شوروم میں آگ لگنے کا پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔ لاٹری، مہربان، سر جھک گیا، گناہ سے گمان تک، پانچ ہزار کا نوٹ اور پھولوں والا راستہ بہترین کہانیاں تھیں۔ نظم پھلوں کا بادشاہ کون؟ بہت پسند آئی۔ (علی رضا چاند، بھابڑہ)

جولائی کے شمارے میں چچا تیزگام کی افطار پارٹی، مبارک سلسلہ، مہربان اور سر جھک گیا کہانیاں بہت اچھی لگیں۔ (تحریم فاطمہ، لاہور)

جولائی کا شمارہ بہت لاجواب تھا۔ ہم سب تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ کھوج لگایئے اور دماغ لڑاؤ ہمارے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ (سدرہ ظفر بٹ، طوبیٰ ظفر بٹ، سویرا ظفر بٹ، لالہ موسیٰ)

کہانیاں سر جھک گیا، گمان سے گناہ تک، پانچ ہزار کا نوٹ، مبارک سلسلہ، مہربان اور یہی ہے پھولوں والا راستہ بہت اچھی تھیں۔ چچا تیزگام کی کہانی پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ سرورق بہت اچھا۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ فٹ بال کے حوالے سے کوئی تحریر شائع کریں۔ (محمد رضوان، لاہور)

☆ ان شاء اللہ جلد آپ کی فرمائش پوری کی جائے گی۔

مبارک سلسلہ اچھی کہانی تھی۔ چچا تیزگام نے کمال کر دیا۔ (نور العین اختر، راول پنڈی)

کہانیوں میں چچا تیزگام کی افطار پارٹی اور مہربان عمدہ تھیں۔ نظم پھلوں کا بادشاہ کون؟ بہت پسند آئی۔ کھیل دس منٹ کا بہت اچھا سلسلہ ہے۔ (محمد طلال ساہی، اقراء اشتیاق ساہی، جہلم)

کہانیاں سر جھک گیا، گمان سے گناہ تک اور مہربان بہت پسند آئیں۔ میری زندگی کے مقاصد اچھا سلسلہ ہے۔ اسے جاری رکھیے۔ (معاذ احمد، لاہور)

سلسلے اور جھل خاکے اور کھیل دس منٹ کا مجھے بہت پسند ہیں۔ (عائشہ ملک، میاں والی)

نظم ''پھلوں کا بادشاہ کون؟'' نظم پڑھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔ واقعاتِ مادرِ ملت پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ (محمد حذیفہ انوار، جھنگ صدر)

جولائی کے شمارے میں تمام کہانیاں لاجواب تھیں۔ (محمد ثوبان میر، گوجرانوالہ)

انوکھی دُنیا بہت دل چسپ ناول ہے۔ (لیلیٰ تنویر، چکوال)

جولائی کا شمارہ لاجواب تھا۔ تمام کہانیاں زبردست تھیں۔ فیروزسنز کے شوروم میں آگ کے حادثے کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ (سلمان ریاض، گوجرانوالہ)

''تعلیم و تربیت'' بہت عمدہ رسالہ ہے۔ اس کی ہر کہانی ہر سلسلہ بہترین ہے۔ (حافظ محمد فرخ حیات، پیر محل)

''سر جھک گیا'' عمدہ کہانی تھی۔ آپ نے کہا تھا کہ جون میں سلسلہ ''میری زندگی کے مقاصد'' ختم کر دیں گے، مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ (شہزادہ صغیر، سرائے سدھو)

☆ بچوں کی پسندیدگی کے باعث یہ سلسلہ بند نہیں کیا گیا۔

گمان سے گناہ تک، سر جھک گیا، پانچ ہزار کا نوٹ اچھی کہانیاں تھیں۔ (محمد آصف، محمد طاہر انجم، حسان محسن، گروٹ)

بچوں کا انسائیکلو پیڈیا اور آیئے عہد کریں بہت اچھے سلسلے ہیں۔
(نور العین، کراچی)

''تعلیم و تربیت'' سے میرا تعلق بہت پرانا ہے۔ ایک تحریر ارسال کر رہی ہوں، اُمید ہے اسے رسالے میں جگہ ملے گی۔
(ڈاکٹر کہکشاں انصاری، بہاول پور)

☆ ہم آپ کو ''تعلیم و تربیت'' میں خوش آمدید کہتے ہیں۔

معلوماتِ عامہ اور اوجھل خاکے سلسلے مجھے بہت پسند ہیں۔
(ارقم احمد، اسلام آباد)

گمان سے گناہ تک اور یہی ہے پھولوں والا راستہ عمدہ کہانیاں تھیں۔
(محمد عبداللہ، پشاور)

چچا تیزگام کی افطار پارٹی، مبارک سلسلہ اور پانچ ہزار کا نوٹ کہانیاں بہت پسند آئیں۔
(ولید حیات، نوشہرہ کینٹ)

یہی ہے پھولوں والا راستہ، پانچ ہزار کا نوٹ اور سر جھک گیا عمدہ کہانیاں تھیں۔ انوکھی دُنیا عمدہ ناول ہے۔
(عبیدالرحمٰن اظہر، اویس پرویز، زین عارف، میر پور)

کیا ہم انعامی سلسلوں کے کوپن کی فوٹو کاپی بھیج سکتے ہیں؟ فیروز سنز کے شوروم میں آگ لگنے کی خبر سن کر بہت افسوس ہوا۔
(شایان اقدس، جہلم)

☆ انعامی مقابلوں میں شرکت کے لیے فوٹو کاپی قابلِ قبول نہیں۔

کہانی چچا تیزگام کی افطار پارٹی بہت مزے کی تھی۔ کیا میں حمد یا نعت لکھ کر بھیج سکتی ہوں؟
(شافیہ ریحان، لاہور)

☆ آپ حمد اور نعت کسی استاد سے اصلاح کے بعد بھیج سکتی ہیں۔

مبارک سلسلہ، چچا تیزگام کی افطار پارٹی، اور لاٹری کہانیاں بہت اچھی تھیں۔
(محمد وحید، راول پنڈی)

چچا تیزگام کی افطار پارٹی اور گمان سے گناہ تک اور مبارک سلسلہ بہترین تحریریں تھیں۔
(اقراء خان، لاہور)

چچا تیزگام میرے اور میرے بھائی کا پسندیدہ کردار ہے۔ چچا تیزگام کی افطاری ضائع ہونے کا بہت افسوس ہوا۔
(ام فروہ، لاہور)

جولائی کے شمارے میں چچا تیزگام کی افطار پارٹی، لاٹری، پھلوں کا بادشاہ کون؟ احسان اور مہربان بہت عمدہ تحریریں تھیں۔
(نزل سعید، شہزینہ سعید، اسامہ سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

''تعلیم و تربیت'' ہاتھ میں آیا تو خوشی ساتویں آسمان پر تھی، مگر پہلے ہی ورق پر فیروز سنز کے شوروم میں لگنے والی آگ کا پڑھ کر دل اداس ہو گیا۔ یہ خبر پڑھنے کے بعد باقی رسالہ مغموم دل سے پڑھا۔ شوروم کی جلد از جلد بحالی کے لیے میری تمام تر دُعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔
(جویریہ رحمٰن رانا، کلورکوٹ)

☆ بہت شکریہ۔

جولائی کے شمارے کا سرورق بہت پسند آیا۔ کہانیاں سر جھک گیا اور پانچ ہزار کا نوٹ بہت اچھی لگیں۔
(اروٰی معطر بیگ، گجرات)

چچا تیزگام کی افطار پارٹی، یہی ہے پھولوں والا راستہ عمدہ کہانیاں تھیں۔
(محمد عمار صدیقی، کراچی)

کھوج لگایئے، آیئے عہد کریں اور کھیل دس منٹ کا میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔
(محمد حسن رضا، جوہر آباد)

کیا میں سلسلہ ''میری زندگی کے مقاصد'' کے لیے اپنی تصویر بھیج سکتی ہوں؟
(خنساء اشرف، لاہور)

☆ ضرور بھیجیے۔

''تعلیم و تربیت'' کے باعث میری مصوری اچھی ہو گئی ہے، اِسی لیے سکول میں منعقدہ مقابلۂ مصوری میں مجھے پہلا انعام ملا ہے۔
(شہربانو نعیم، لاہور)

جولائی کا رسالہ زبردست تھا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ میری طرف سے تعلیم و تربیت کی ٹیم کو عید مبارک قبول ہو۔
(انصر صابر، وہاڑی)

☆ خیر مبارک۔

پیار، مہربان اور چچا تیزگام کی افطار پارٹی کہانیاں بہت پسند آئیں۔
(شائلہ رانا، محمد ضیاء اللہ، میاں والی)

کہانیوں میں مہربان اور چچا تیزگام کی افطار پارٹی بہت زیادہ پسند آئیں۔
(بشریٰ خاتون، گوجرانوالہ)

اس مرتبہ سرورق بہت اچھا تھا۔
(عبداللہ نوید، اسلام آباد)

جولائی کا شمارہ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔
(لائبہ خالد، واہ کینٹ)

''تعلیم و تربیت'' بچوں کے لیے تفریح، دل چسپی اور معلومات کا خزانہ ہے۔
(حامد رضا، منور حیات، عثمان سلیم، شاہد محمود، تاندلیانوالہ)

پھلوں کا بادشاہ کون؟ اچھی نظم تھی۔
(صباء ناز، گوجرانوالہ)

دیکھ کر دونوں گھبرا گئے تھے۔

''کک.... کک.....کون ہو تت..... تت..... تم؟'' خوف کے مارے عمر سے بات بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔

''گاڑی میں بیٹھ جاؤ، وقت ضائع مت کرو۔'' جگو غرایا۔
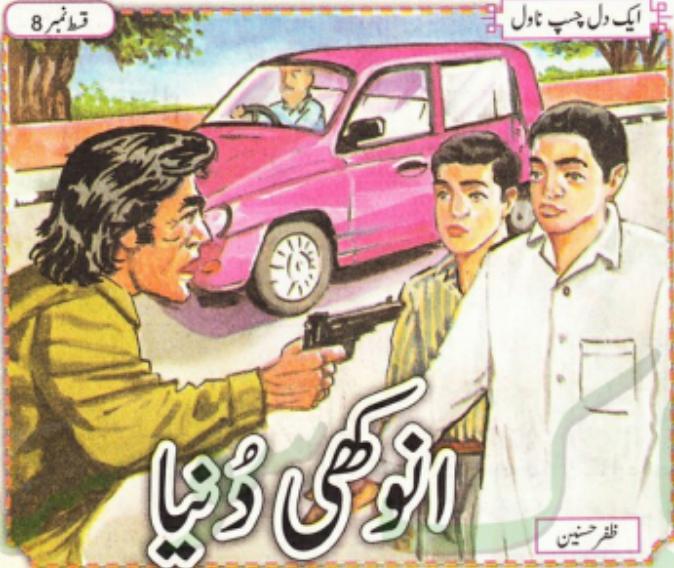
''جگو ہمارے پاس وقت کم ہے، جلدی سے دونوں کو ڈالو گاڑی میں۔'' گاڑی چلانے والا موٹا آدمی پہلی بار بولا تھا۔

پھر عمر اور جواد کو جگو نے زبردستی گاڑی میں بٹھا لیا۔

کار اُن کے پاس آ کر رکی تھی۔ عمر اور جواد حیرت سے کار کو دیکھ رہے تھے۔

''یہ شامی روڈ کس طرف ہے؟'' کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے جگو نے دونوں کو مخاطب کیا۔

''دائیں طرف شامی روڈ ہے۔'' عمر نے جواب دیا۔

''ہم اجنبی ہیں، کافی دیر سے شامی روڈ تلاش کر رہے ہیں، گاڑی میں بیٹھ جاؤ اور ہمیں بتاؤ کہ شامی روڈ کدھر ہے۔'' یہ کہہ کر پچھلی سیٹ پر بیٹھے جگو نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور دونوں کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں کی چھٹی حس نے بتا دیا تھا کہ یہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ سڑک اس وقت سنسان تھی۔ سورج غروب ہوتے ہی اس سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر ہوتی تھی۔

''جواد! آؤ گھر چلتے ہیں۔'' عمر نے جواد کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''ہم تمہیں گھر جانے دیں گے تو گھر جاؤ گے۔'' جگو بولا۔

''کیا مطلب؟'' عمر بولا۔

''سیدھی طرح گاڑی میں بیٹھ جاؤ ورنہ میں ابھی تم دونوں کا کام تمام کر دوں گا۔'' یہ کہہ کر جگو نے دونوں پر پستول تان لیا۔ پستول

دونوں خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہے تھے۔

''اگر شور مچایا تو گولی مار دوں گا۔'' جگو بدستور ان پر پستول تانے ہوئے چلایا۔

گاڑی مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی ایک ویران عمارت میں جا کر رک گئی۔ عمارت میں ایک طرف مدھم سی روشنی تھی۔ عمر اور جواد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک نیم تاریک کمرے میں موجود تھے۔ عمر نے تو ابھی تک اپنے حواس پر قابو رکھا ہوا تھا، مگر اس تم تاریک کمرے میں آ کر جواد تو زارو قطار رونے لگا تھا۔

''یہ رونا دھونا بند کرو، مجھے رونے دھونے سے شدید نفرت ہے۔'' جگو دونوں کو گھورتے ہوئے بولا۔

''تم لوگ کون ہو اور ہمیں یہاں کیوں لائے ہو؟'' عمر نے ہمت کر کے جگو سے پوچھا۔

''ابھی معلوم ہو جائے گا کہ ہم کون ہیں اور تم لوگوں کو یہاں کیوں لائے ہیں؟'' یہ کہہ کر جگو نے موبائل فون پر ایک نمبر ڈائل کرنے کے بعد کان سے لگا لیا۔ کچھ دیر بعد جگو نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''میری آواز تو تم نے ضرور پہچان لی ہوگی۔''

''میں تمہارا آواز نہیں پہچان سکا، کون ہو تم؟''

''اچھا تو تم نے میری آواز نہیں پہچانی، یہ تو بہت بُری بات ہے، کان کھول کر سنو، میں جگو بول رہا ہوں۔''

''جگو!'' دُوسری طرف سے دہرایا گیا۔

''ہاں جگو، جمیل میری بات غور سے سن لو اگر تم نے راجو کے خلاف گواہی دی تو پھر......'' جگو نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تو پھر کیا؟''

''تو پھر تم اپنے اکلوتے بیٹے کو زندہ نہیں دیکھو گے۔''

''کیا بک رہے ہو تم؟'' عمر کے ابو جمیل نے چلاتے ہوئے کہا۔

''میں جو کہتا ہوں، وہ کرتا بھی ہوں، سوچ لو اگر بیٹا چاہیے تو راجو کے خلاف گواہی مت دو، اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارا بیٹا زندہ گھر آ جائے گا ورنہ......''

''میرے بیٹے کو کچھ مت کہنا۔'' جمیل نے التجا کی۔

''لو اپنے بیٹے سے بات کر لو۔'' یہ کہہ کر جگو نے موبائل فون عمر کے کان سے لگا کر کہا: ''بولو، اپنے باپ سے بات کرو۔''

''ابو جان!'' یہ کہتے ہی عمر زاروقطار رونے لگا۔

''میرے بیٹے حوصلہ کرو اللہ تعالیٰ سب ٹھیک کر دے گا۔'' جمیل نے اتنا ہی کہا تھا کہ جگو نے موبائل فون عمر سے چھین لیا۔

''جمیل! آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے، میں کل دوبارہ فون کروں گا اور ہاں یاد رکھو پولیس کو اطلاع دی تو اچھا نہ ہوگا۔'' یہ کہہ کر جگو نے فون بند کر دیا۔

☆......☆......☆

عمر کے ابو رات کو ہی اسلام آباد سے واپس آ گئے تھے۔ عمر کی امی، عائشہ اور جواد کے امی، ابو ڈرائنگ روم میں پریشان بیٹھے تھے۔ جواد کے ماموں انور پولیس انسپکٹر تھے، وہ بھی سادہ کپڑوں میں تھوڑی دیر پہلے وہاں آئے تھے۔

''جمیل صاحب! آپ نے اب کیا سوچا ہے؟'' جواد کے ابو قمر نے پوچھا۔

''میں راجو کے خلاف گواہی دوں گا، راجو نے پیارے پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔''

''اس طرح تو عمر اور جواد کی زندگیوں کو خطرہ لاحق ہوگا، آپ مت دیں راجو کے خلاف گواہی، میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔'' عمر کی امی نے روتے ہوئے کہا۔

''راجو جیسے آدمیوں کے خلاف گواہی نہ دینا بہت بڑا جرم ہے، ایسے ملک دشمن لوگوں کے خاتمے کے لیے ہم سب کو آگے آنا چاہیے۔'' جمیل نے کہا۔

راجو دراصل محکمہ جنگلات میں ملازم تھا۔ اُس نے بہت سے قیمتی درخت اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کاٹے تھے۔ جب وہ درختوں کو کاٹ کر ٹرکوں پر لاد کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ فرار ہو رہے تھا تو جمیل نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ راجو کی نظر بھی جمیل پر پڑ گئی تھی۔ راجو کو جلد ہی درختوں کی چوری کے جرم میں گرفتار کر لیا تھا۔ وہ کافی عرصہ سے درختوں کی چوری کر رہا تھا۔ بدھ کو راجو کو عدالت میں پیش کیا جانا تھا جب کہ پیر کے روز عمر اور جواد کو اغوا کر کے جمیل پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ وہ گواہی دینے کے لیے عدالت نہ جائے۔

سبھی لوگ ڈرائنگ روم میں کسی گہری سوچ میں گم تھے کہ جمیل کا فون بج اٹھا تھا۔ اس سے قبل کہ جمیل بٹن دبا کر بات کرتا۔ جواد کے ماموں انور نے فون کی آواز بلند کرنے کا اشارہ کیا۔ جب جمیل نے بٹن دبایا تو دُوسری طرف سے جگو نے کہا:

''کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟''

''میں راجو کے خلاف گواہی دوں گا۔'' جمیل نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

''لگتا ہے تمہیں اپنے بیٹے سے پیار نہیں ہے۔''

''مجھے اپنے بیٹے سے بہت پیار ہے، مگر میں اپنے وطن کا بھی بیٹا ہوں، میں اپنے پیارے وطن کو بیٹا بن کر دکھاؤں گا۔''

"تو پھر اپنے بیٹے کی موت کا انتظار کرو۔" یہ کہہ کر جگو نے غصے سے فون بند کر دیا۔

☆......☆......☆

عمر اور جواد نیم تاریک کمرے میں ایک ٹوٹے پھوٹے فرش پر بیٹھے تھے کہ اچانک عمر کی نظر دائیں طرف ایک پرانی سی الماری میں رکھی کچھ کتابوں پر پڑی۔ کتابیں الماری میں ہل رہی تھیں۔ عمر اٹھ کر الماری کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے منہ میں منتر پڑھ کر کتابوں پر پھونکا تو پرانی جلد والی ایک کتاب کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"رانی! میں اس لڑکے کو جانتی ہوں۔"

"کون ہے یہ لڑکا؟" رانی نے عمر کی طرف دیکھتے ہوئے روشنی سے سوال کیا۔

"ڈولی اس کے گھر میں رہتی ہے۔" روشنی بولی۔

"کون ڈولی؟" رانی نے ایک اور سوال داغا۔

لو بھئی تم ڈولی کو بھی بھول گئی ہو، ڈولی وہی ہے جس سے ہماری ملاقات ریس کورس پارک میں لگنے والی کتابوں کی نمائش میں ہوئی تھی۔"

"اچھا......اچھا مجھے یاد آ گیا ہے۔" رانی نے فوراً کہا۔

کچھ دیر بعد جواد بھی عمر کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"لگتا ہے تم کتابوں کی باتیں سن رہے ہو۔"

"ہاں میں کتابوں کی باتیں سن رہا ہوں، تم بھی ان کی باتیں سن لو۔" عمر نے یہ کہہ کر منہ میں کچھ بڑبڑایا تو جواد بھی کتابوں کی باتیں با آسانی سن سکتا تھا۔

"دونوں اس وقت مشکل میں ہیں، ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔" روشنی کی بات سن کر رانی نے کہا۔

"ان کی مدد کرنا ہمارے لیے کون سا مشکل کام ہے، میں ابھی ڈولی کے پاس جاتی ہوں اور اُس کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کرتی ہوں۔"

"اتنی رات گئے تم اکیلی ڈولی کے پاس جاؤ گی، میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" رانی بولی۔

پھر دونوں کتابیں الماری سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھیں۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔

"اب کیا کریں؟" رانی نے سوال کیا۔

"میں ابھی یہاں سے نکلنے کا راستہ بناتی ہوں۔" یہ کہہ کر روشنی نے دروازے کے بائیں پٹ پر دباؤ ڈالا تو اتنا راستہ بن گیا کہ دونوں کتابیں وہاں سے آسانی سے باہر نکل گئیں۔ عمر اور جواد حیرت میں گم دونوں کو تک رہے تھے۔ اُن کو اُمید ہو چکی تھی کہ وہ اب یہاں سے نکلنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ رات کے اندھیرے میں روشنی اور رانی، ڈولی تک پہنچ چکی تھیں۔ روشنی کی زبانی جب ڈولی کو عمر کے بارے میں پتہ چلا تو وہ فوراً کمرے سے باہر چلی گئی۔

(ڈولی کمرے سے باہر کہاں گئی تھی؟ یہ جاننے کے لیے اگلی قسط پڑھیے۔)

راستہ دو

نذیر انبالوی

عصر کی نماز کے بعد حق نواز کے ہاں افطاری کے لیے امی جان نے پکوڑے، آلو کی ٹکیاں اور لسی بنانے کا آغاز کر دیا تھا۔ گاؤں میں آباد اس زمین دار گھرانے میں دو بھائی اکٹھے رہتے تھے۔ ان کی اکلوتی بہن کی شادی دُوسرے گاؤں میں چند سال پہلے ہوئی تھی۔ زرعی زمین کچھ زیادہ نہ تھی، دونوں بھائی مل کر کھیتی باڑی کرتے تھے، جس سے زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ بڑے بھائی طفیل کی شادی ہو چکی تھی اور اس کا ایک بیٹا حق نواز گھر بھر کی آنکھوں کا تارا تھا۔ طفیل کے چھوٹے بھائی راحیل کی شادی عیدِ قربان کے بعد اس کے چچا کے ہاں طے پائی تھی۔ راحیل کو پہلوانی کا بہت شوق تھا۔ وہ گاؤں میں میلے کے موقع پر ہونے والی کشتی کے کئی مقابلے جیت چکا تھا۔ حق نواز میں تو گویا اس کی جان تھی، وہ جب بھی کھیتوں سے واپس گھر آتا اگر اُسے حق نواز نظر نہ آتا تو فوراً گھر میں شور مچا دیتا۔

''بھابی...... بھابی جی یہ حق نواز کہاں ہے؟''

''یہیں کہیں ہو گا۔''

''کہیں وہ گھر سے باہر تو نہیں چلا گیا؟'' راحیل حق نواز کو اِدھر اُدھر تلاش کرتے ہوئے کہتا۔

''نہیں، وہ ابھی تو یہیں تھا۔'' حق نواز کی امی جان کہتیں۔

''میرا خیال ہے حق نواز گھر میں نہیں ہے، وہ ضرور اپنے دوستوں کے ساتھ آموں والے باغ میں گیا ہو گا، میں نے آج اُسے وہاں پکڑ لیا تو اُس کی ایسی مرمت کروں گا کہ عمر بھر یاد رکھے گا، پھر آپ نے بیچ میں نہیں آنا۔'' راحیل بولتا چلا گیا۔

''میری کیا مجال ہے کہ چچا بھتیجے کے جھگڑے میں آؤں۔'' حق نواز کی امی جان بولیں۔

حق نواز اس ساری صورتِ حال سے محظوظ ہو رہا تھا۔ وہ مرغیوں کے ڈربے کی اوٹ میں چھپا اپنی امی اور چچا کی باتیں سن رہا تھا۔ راحیل جب غصے میں بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو حق نواز ایک دم اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم کہاں تھے شیطان؟''

''میں تو مرغیوں کے ڈربے کی اوٹ میں تھا، آپ کو تنگ کرنے میں مزا جو آتا ہے۔''

''میں ابھی تمہاری خبر لیتا ہوں، شیطان کہیں کے۔'' یہ کہہ کر حق نواز آگے آگے اور راحیل اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔ آخر راحیل نے حق نواز کو پکڑ ہی لیا۔

افطاری کے وقت راحیل نے محسوس کیا کہ طفیل کچھ پریشان سا تھا۔ افطاری کے بعد راحیل نے جب طفیل سے پریشانی کی وجہ

پوچھی تو اُس نے کہا۔

''میرے دوست صدیق نے بتایا ہے کہ ساتھ والے گاؤں میں سکھوں نے مسلمانوں کے قتلِ عام کا بازار گرم کر رکھا ہے، ہمارے گاؤں پر بھی سکھ کسی وقت بھی دھاوا بول سکتے ہیں، اس سے قبل کہ سکھ اس طرف کا رخ کریں ہمیں خود ہی یہاں سے چلے جانا چاہیے۔''

''بھائی! کیسی باتیں کرتے ہو، تارا سنگھ نے چوپال میں بیٹھ کر جو کچھ کہا تھا کیا وہ تمہیں یاد نہیں، اُس نے کہا تھا کہ میرے ہوتے ہوئے کوئی سکھ مسلمانوں کا بال بیکا بھی نہیں کر سکتا۔''

''تارا سنگھ کی ساری باتیں مجھے یاد نہیں، لیکن اس کے باوجود ہمارا اس جگہ ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں۔''

''ہم کس طرح یہاں سے جا سکتے ہیں، یہ گھر، زمین اور سب سے بڑھ کر بزرگوں کی قبریں، کیا سب کچھ یہاں چھوڑ کر چلے جائیں۔'' راحیل بولا۔

''ہمیں ایسا ہی کرنا ہوگا، آزادی کے لیے قربانیاں تو دینی ہی ہوتی ہیں، ہمارے پاس وقت کم ہے، ہم نے جو کچھ بھی کرنا ہے نہایت خاموشی سے کرنا ہے، گاؤں کے لوگوں کو بھی ساتھ لے کر چلیں گے اور ہاں اسی وقت بلقیس بہن کے گھر چلے جاؤ، انہیں بھی چلنے کے لیے تیار کرو۔'' طفیل کی بات سن کر راحیل کچھ دیر خاموش رہا پھر وہ پُرنم آنکھوں سے اپنے بھائی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا ہم یہاں سے چلے جائیں گے؟''
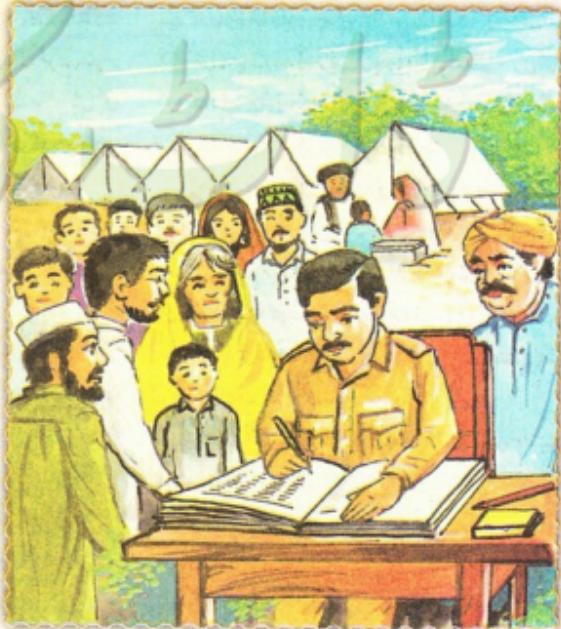
''ہاں، ایک آزاد وطن ہمارا انتظار کر رہا ہے، دیر مت کرو ہمیں آج رات یہاں سے نکل جانا ہے۔''

☆......☆......☆

وہ رمضان المبارک کی ۲۷ ویں رات تھی۔ افطاری کے وقت تمام لوگ طفیل کے گھر جمع ہو گئے تھے۔ کچھ ضروری سامان باندھ کر وہ لوگ رات کے اندھیرے میں اپنے گھروں، زمینوں اور بزرگوں کی قبروں کو آخری بار دیکھ کر آزادی کی خاطر گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اُس رات ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ وہ چھپتے چھپاتے کھیتوں سے ہو کر پکی سڑک کی طرف بڑھے تو کنویں کے قریب انہیں محسوس ہوا کہ کوئی ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ طفیل نے خطرے کو بھانپ کر سب کو مکئی کے کھیت میں چھپنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تارا سنگھ کے بیٹے دارا سنگھ کی آواز سن رہے تھے۔ وہ اپنے دوست دلیر سنگھ سے کہہ رہا تھا۔

''لگتا ہے ہاتھ سے نکل گئے ہیں مُسلے، اگر ہاتھ آ جائے تو مدتوں سے پیاسی کرپان کی پیاس بھی بجھ جاتی۔''

''طفیل نے بھاگنے کا پروگرام اس طرح بنایا ہے کہ گاؤں میں کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی، بڑھا تیز نکلا ہے طفیل، اگر ہاتھ آ جاتا تو مزا ہی آ جاتا۔'' دلیر سنگھ کی باتیں سن کر راحیل نے جان لیا کہ ان کا گاؤں سے نکلنا درست فیصلہ تھا۔ وہ کافی دیر تک کھیت میں چھپے رہے۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ دارا سنگھ اور اس کے ساتھی وہاں سے چلے گئے ہیں تو وہ سب کھیتوں سے نکل کر اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ ساری رات چھپتے چھپاتے آگے بڑھتے رہے۔ سحری کے وقت انہوں نے پوٹلی میں بندھی روٹیوں کو اچار کے ساتھ کھا کر روزہ رکھا۔ جب چہار سُو دن کا اُجالا پھیلا تو ان کے لیے خطرہ بڑھ گیا تھا۔ وہ پیدل چلتے ہوئے آخر کار پکی سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ حق نواز کو پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے لیے چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ حق نواز کی حالت دیکھ کر راحیل نے اُسے کندھوں پر بٹھا لیا تھا۔ پکی سڑک کے قریب ہی انہیں ایک کنواں نظر آیا۔ وہ حق نواز اور دُوسرے بچوں کو پانی پلانے کے لیے وہاں رکے تو سکھوں کا ایک جتھا (گروہ) اُدھر آ نکلا۔ سب کے ہاتھوں میں کرپانیں اور تلواریں تھیں۔ سکھوں نے کنویں کے پاس بیٹھے لوگوں کو گھیرے میں لے لیا تھا۔

''بولو کیا نام ہے تمہارا؟'' ایک سکھ نے کرپان لہراتے ہوئے پوچھا۔

''طفیل، میرا نام طفیل ہے۔''

''اوہ، تم تو دارا سنگھ کے گاؤں کے ہو۔'' ایک اور سکھ تلوار لیے آگے بڑھا۔

''جی...... جی......'' طفیل بولا۔

''بھاگ رہے ہو یہاں سے، آزادی کے لیے، نئے دیس کے لیے، بش سنگھ دے دو ان کو آزادی، سب کو آزاد کر دو زندگی کی قید

سے، دے دو ان کو آزادی، کوئی بچ کر نہ جائے۔'' سکھ کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ مسلح سکھ نہتے مسلمانوں پر پل پڑے۔ راحیل نے پہلوانی کا ایک داؤ مار کر ایک سکھ سے تلوار چھین لی تھی۔ وہ اب تنہا سب کا مقابلہ کر رہا تھا۔ یہ خونی منظر دیکھ کر حق نواز بے ہوش ہو گیا تھا۔ جب اُسے ہوش آیا تو وہ ٹرین کے ڈبے میں تھا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں تو اُس کا سر اپنے ابو جان کی گود میں تھا۔ ابو جان کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو رہی تھیں۔ حق نواز نے گود میں سر رکھے ہوئے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ جب اُسے کوئی شناسا چہرہ دکھائی نہ دیا تو اُس نے ابو جان سے پوچھا۔

''امی جان، چچا جان اور پھوپھی جان کہاں ہیں؟''

''وہ سب تو اللہ تعالیٰ کے پاس جا چکے ہیں، آزادی کی خاطر انہوں نے جام شہادت نوش کیا ہے، آزادی کا چراغ روشن کرنے کے لیے سب نے اپنا لہو اس میں شامل کر دیا ہے۔'' ننھا حق نواز ان باتوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ ڈبے میں ہر کوئی زخموں سے چور تھا، مگر آزاد وطن میں جانے کی خوشی بھی بہت تھی۔ ٹرین کو راستے میں کئی بار روک کر سکھوں نے اس پر حملے کیے، مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا، ڈبے میں لاشیں، خون، خوف اور دہشت تھی۔

حق نواز تین دن بعد اپنے ابو جان کے ساتھ والٹن مہاجر کیمپ میں موجود تھا۔ کچھ دنوں بعد اس کیمپ میں ان کے گاؤں کے کچھ لوگ بھی آ گئے تھے۔ وہ کچھ دن تو اس کیمپ میں رہے پھر ان کی آبادی کاری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ طفیل کو جلد ہی لاہور میں ایک پرانا مکان الاٹ ہو گیا تھا۔ پہلے پہل تو طفیل نے ریلوے اسٹیشن پر قلی کی حیثیت سے کام کیا پھر ایک جاننے والے کے ساتھ سائیکلوں کے فاضل پرزے جات کی ایک فیکٹری میں ملازم ہو گیا۔ طفیل کو جو مکان الاٹ ہوا تھا۔ اس کے آس پاس تیزی سے نئے مکان بننے لگے تھے۔ چند سالوں ہی میں وہاں اچھی خاصی آبادی ہو گئی تھی۔ طفیل نے اب اپنے علاقے میں سائیکلوں کی مرمت کی ایک دُکان کھول لی تھی۔ کچھ عرصے ہی میں اس کا کام چل نکلا تھا۔ حق نواز بھی پرائمری جماعت پاس کر کے اپنے ابو جان کے ساتھ دُکان پر آ بیٹھا تھا۔ حق نواز کی وجہ سے طفیل نے دُوسری شادی بھی نہیں کی تھی۔ اب حق نواز ہی اس کے لیے سب کچھ تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ حق نواز کی شادی ہو گئی۔ اب اُس کا ایک بیٹا سیف اللہ تھا۔

کچھ عرصہ بعد حق نواز نے ایک آدمی کے ساتھ کاروباری شراکت کر کے سائیکلوں کے فاضل پرزہ جات کا ایک چھوٹا سا کارخانہ بنا لیا۔ پاکستان آنے پر الاٹ ہونے والا پرانا سا مکان اب عالی شان طفیل بلڈنگ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اب یہ بلڈنگ شہر کے اہم تجارتی مرکز کا حصہ بن گئی تھی۔ یہاں ہر وقت ٹریفک کا رش رہتا تھا۔

کچھ دنوں قبل ایک بلڈنگ میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ بلڈنگ کی طرف جانے والا راستہ اتنا تنگ تھا کہ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں وہاں تک پہنچ نہ سکی تھیں، جس کے باعث آگ

پر قابو نہ پایا جا سکا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس سڑک پر ٹریفک کا رش مزید بڑھ رہا تھا۔

☆......☆......☆

''دادا جان! یہ کیسے ہو سکتا ہے، ہم ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔'' حق نواز کے پوتے دانیال نے ایک اخبار میز پر پٹختے ہوئے کہا۔

''کیا نہیں ہونے دو گے؟'' حق نواز نے دانیال کی طرف دیکھا۔

''آپ خود ہی خبر پڑھ لیں، سرکار نے یہاں ایک پل بنانے کا منصوبہ بنایا ہے، اس منصوبے کی تکمیل کے لیے بہت سی عمارتوں کو گرایا جائے گا، ان عمارتوں میں ہماری عمارت بھی شامل ہے۔'' دانیال نے تفصیل بتائی۔

''ہم سرکار کو اپنی بلڈنگ گرانے نہیں دیں گے۔'' حق نواز کے بولنے سے قبل اس کا دوسرا پوتا ذیشان بھی بول پڑا۔

پھر حق نواز اخبار میں نئے پل کی تعمیر کے حوالے سے خبر پڑھنے لگا۔ وہ یہ خبر پڑھ کر کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ وہ گہری سوچ میں گم ہی تھے کہ سیف اللہ غصے میں بھرا اُن کے کمرے میں آیا۔

''ہم یہ ظلم نہیں ہونے دیں گے، ہم عدالت میں جائیں گے۔''

حق نواز جان گیا تھا کہ سیف اللہ کس بارے میں بات کر رہا ہے۔
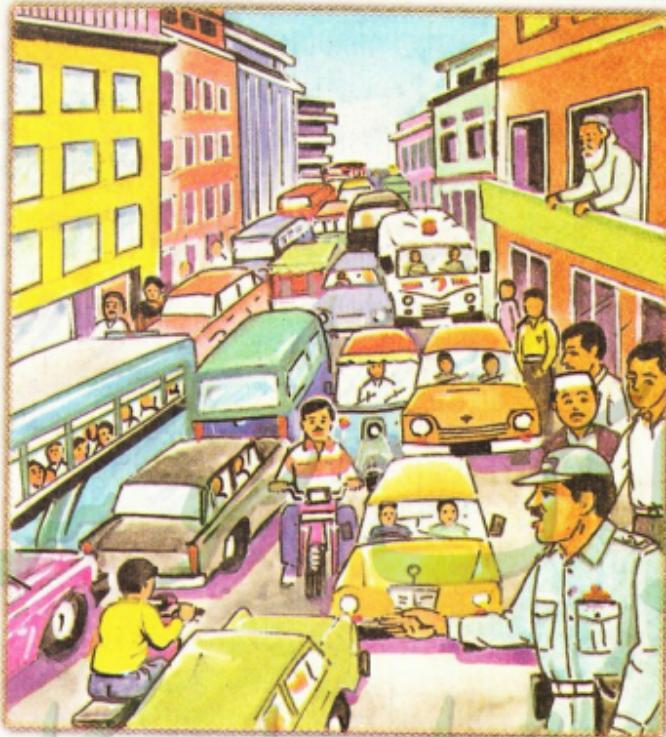
''دیگر عمارتوں کے مالکان کا کیا موقف ہے؟''

''سب غصے سے بھرے بیٹھے ہیں، کوئی بھی اپنی عمارت گرانے کی اجازت نہیں دے گا، پل کسی اور جگہ بھی تو بنایا جا سکتا ہے۔''

''بیٹا! پل کی ضرورت تو اس جگہ ہے پھر پل کسی دوسری جگہ کیسے بنایا جا سکتا ہے، کیسے مشکل سے سڑک سے گزر کر ایمبولینس ہسپتال پہنچتی ہے، ہم سب ہر روز دیکھتے ہیں کہ ایمبولینس کس طرح اپنا راستہ حاصل کرتی ہے۔'' حق نواز نے کہا۔

''ابا جان! اس کے باوجود ہم اپنی بلڈنگ سرکار کو گرانے نہیں دیں گے۔'' سیف اللہ کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔

دوسرے دن احتجاجی مظاہرے میں سیف اللہ اور اُس کے بیٹے پیش پیش تھے۔ سب گلے پھاڑ پھاڑ کر سرکار کے خلاف نعرے بازی کر رہے تھے۔ یہ احتجاج کافی دنوں تک جاری رہا۔ سب بلڈنگوں کے مالکان عدالت میں چلے گئے تھے۔ جس کے باعث پل کی تعمیر کا آغاز نہ ہو سکا تھا۔ 14 اگست کا دن بہت قریب تھا۔ حق نواز نے چوتھی منزل کی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو ہر بلڈنگ پر سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا۔ اس پرچم کو لہراتے ہوئے دیکھ کر برسوں قبل کے واقعات حق نواز کی آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے تھے۔ حق نواز نے سڑک پر نگاہ ڈالی تو وہاں حسب معمول ٹریفک بلاک تھی۔ گاڑیوں والے ہارن بجا بجا کر آگے بڑھنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ اتنی دیر میں ایک ایمبولینس ہوٹر بجاتی ہوئی اُدھر آ گئی۔ ایمبولینس کے پاس اس سڑک کے علاوہ کوئی متبادل راستہ نہ تھا۔ اسی اثناء میں سیف اللہ بھی کھڑکی کے پاس آ گیا تھا۔

''ابا جان! کیا دیکھ رہے ہیں؟''

''سڑک پر پھنسی ہوئی ٹریفک دیکھ رہا ہوں۔''

''ابا جان! یہ تو ہر وقت کا معمول ہے۔'' سیف اللہ نے جھٹ کہا۔

وہ دیکھو ٹریفک میں ایمبولینس بھی پھنسی ہوئی ہے، نہ جانے کون ایمبولینس میں ہے۔''

''آپ کیوں دل میلا کرتے ہیں، ایمبولینس میں کوئی بھی ہو ہمیں اس سے کیا۔'' سیف اللہ نے بے نیازی سے کہا۔

''ایسی باتیں مت کرو، مجھے ایسی باتیں سن کر دکھ ہوتا ہے۔'' حق نواز نے سیف اللہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

ایمبولینس مسلسل ہوٹر بجا رہی تھی۔ سڑک کی دائیں جانب ایک موڑ تھا وہاں ایک ٹرک پھنسا ہوا تھا۔ ٹریفک کانسٹیبل ٹریفک کو بحال کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا، مگر گاڑیوں کا رش اس قدر تھا کہ ٹریفک پر قابو پانا ممکن دکھائی نہ دے رہا تھا۔ گاڑیوں کے شور میں ایمبولینس کا ہوٹر چیخ چیخ کر یہ احتجاج کر رہا تھا کہ مجھے راستہ

قاتل تصور کر رہے تھے کیوں کہ نئے پل کی تعمیر میں انہوں نے رکاوٹیں کھڑی کی تھیں۔ سب کے سر جھکے ہوئے تھے۔ سب حق نواز کو تک رہے تھے، جو انہیں پل کی تعمیر میں حائل ہر رکاوٹ ہٹانے کے لیے کہتا تھا۔ سیف اللہ بھی خاموش تھا۔ وہ اس سوچ میں گم تھا کہ اگر اس ایمبولینس میں اس کا بیٹا ہوتا تو کیا ہوتا۔

شام کے وقت سب لوگ حق نواز کے سامنے بیٹھے تھے۔ سب کے کانوں میں ایمبولینس کے ہوٹر کی آواز کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ سب کو خاموش دیکھ کر حق نواز نے بات شروع کی تھی۔ ”جب بھی وطنِ عزیز میں ترقی کی کوئی بات ہوتی ہے تو ہم ہمیشہ انفرادی مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، اجتماعی مفاد کا ہم کبھی خیال نہیں کرتے، جب تک ہم انفرادی مفاد کو اجتماعی مفاد پر قربان نہیں کریں گے پیارا وطن ترقی کی طرف گام زن نہیں ہو سکتا، پل کی تعمیر کے لیے چار بلڈنگوں کے گرائے جانے سے صرف پچاس ساٹھ لوگ متاثر ہوں گے جب کہ پل کی تعمیر سے فائدہ کروڑوں لوگوں کو ہوگا، بتایئے اب آپ لوگوں کا کیا فیصلہ ہے؟“

”ہم انفرادی راستے کی بجائے اجتماعی راستے پر چلیں گے کیوں کہ یہ ہی راستہ ترقی کی طرف جاتا ہے۔“ وہاں پر موجود سب لوگوں نے عبدالعزیز کی بات کی تائید کی تھی۔ حق نواز کے چہرے پر اطمینان تھا، خوشی تھی، سکون تھا۔ اُسے یقین تھا کہ ان بلڈنگوں کو گرانے کے بعد جب پل تعمیر ہو گا تو تب کسی ایمبولینس کا ہوٹر ”راستہ دو، راستہ دو“ کا شور نہیں مچائے گا۔

دو، میں نے موت حیات کی کش مکش میں مبتلا مریض کو ہسپتال لے کر جانا، مگر کوئی ہوٹر کی اس پکار کو نہیں سن رہا تھا۔ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ عجیب نفسا نفسی کا عالم تھا۔ حق نواز اور سیف اللہ مسلسل کھڑکی میں کھڑے سڑک پر پھنسی ٹریفک کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ایمبولینس کا دروازہ کھلا اور ایک عورت چیختی چلاتی باہر نکلی اور روتے ہوئے بولی۔

”میرا بیٹا مر گیا، ہائے میرا بیٹا مر گیا۔“

اس کی درد بھری آواز سن کر آس پاس کی بلڈنگوں کے لوگ بھی کھڑکیوں سے جھانکنے لگے۔ عورت مسلسل آنسو بہاتے ہوئے چیخ و پکار کر رہی تھی۔ ایمبولینس کا ہوٹر ”راستہ دو، راستہ دو“ کا شور مچاتا ہوا خاموش ہو چکا تھا۔ اب اُسے کہیں جانے کی جلدی نہیں تھی۔ کھڑکیوں سے جھانکتے ہوئے لوگوں کے دل اس عورت کی چیخ و پکار سے دہل گئے تھے۔ وہ سب خود کو اس عورت کے بیٹے کا

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 اگست 2012ء ہے۔

جولائی 2012ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- بول میری مچھلی کتنا پانی! (ھادیہ خالد، لاہور)
- مچھلیوں کے درمیان، بھولو میاں پریشان (علیشہ نایاب، ڈیرہ اسماعیل خان)
- مچھلیو! مجھے بھی تیرنا سکھاؤ۔ (عائشہ رضا، کراچی)
- منا مچھلیوں کے جھرمٹ میں۔ (محمد ابوبکر صدیق یوسف زئی، ٹیکسلا)
- بلو نے چھلانگ لگائی، مچھلیوں نے دوڑ لگائی۔ (منیبہ عدنان، لاہور)